استحکامِ پاکستان

اور

مسئلہ سندھ

ڈاکٹر اسرار احمد

اشاعت اول ——— جنوری ۱۹۸۷ء ——— ۳۳۰۰

اشاعت دوم ——— فروری ۱۹۸۷ء ——— ۳۲۰۰

اشاعت سوم ——— اکتوبر ۱۹۹۲ء ——— ۱۰۰۰

ناشر ——— ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مطبع ——— مکتبہ جدید پریس، ۹۔ ریلوے روڈ لاہور

قیمت ——— [redacted] روپے

۴۰

۹۳ھ مطابق ۷۱۲ء میں

اسلام بیک وقت

برِعظیم ہند میں براستہ سندھ

اور

برِاعظم یورپ میں براستہ سپین داخل ہوا تھا

سپین سے اسلام اور مسلمانوں کا خاتمہ ہوتے پانچسو برس ہو چکے ہیں !

کیا اب وہی تاریخ سندھ میں بھی دہرائی جانیوالی ہے؟

"آگ ہے اولادِ ابراہیم ہے نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے؟"

فاعتبروا یا اولی الابصار

مندرجات

مقدمہ

- حرفِ آغاز ۹
- پاکستان کے عدمِ استحکام کی نئی جہتیں ۱۱

مسئلۂ سندھ

- تمہید ۳۱
- قدیم سندھی مسلمانوں کی عمومی بے چینی کے عناصرِ ثلاثہ ۳۵
- مہاجرین کا ردِ عمل ۶۱
- جنرل محمد ضیاء الحق کا دورِ حکومت
اور موجودہ صورتِ حال ۷۳

تشخیص و علاج

- اصل سبب کیا ہے اور ذمہ دار کون ؟ ۹۳
- مستقل علاج اور فوری تدابیر ۱۱۳

سندھ کے اُن مُسلمانوں کے نام

جو آج بھی ؎

توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے
آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا !

کے مصداق

اسلام کی اُن قدیم اور خالص عربی روایات کے امین ہیں جو

محمدؐ بن قاسمؒ

اور اُن کے ساتھیوں کے ساتھ سندھ میں آئیں

علامہ اقبال مرحوم کے حسب ذیل اشعار محمد بن قاسمؒ اور اُن کے ساتھیوں پر بھی اسی طرح صد فی صد منطبق ہوتے ہیں جس طرح طارق ابن زیادؒ اور اُن کے رفقاء پر، لہٰذا صرف ایک لفظ کے تغیر کے ساتھ مسلمانانِ سندھ کی خدمت میں پیش ہیں :

آہ وہ مردانِ حق ! وہ عربی شہسوار
حاملِ "خلقِ عظیم" صاحبِ صدق و یقیں
جن کی حکومت سے ہے فاش یہ رمزِ غریب
سلطنتِ اہلِ دل فقر ہے، شاہی نہیں !
جن کی نگاہوں نے کی تربیتِ شرق و غرب
ظلمتِ یورپ میں بھی جن کی خرد راہ بیں !
جن کے لہو کی طفیل آج بھی ہیں اہلِ سندھ
خوش دل و گرم اختلاط، سادہ و روشن جبیں
آج بھی اس دیس میں عام ہے چشمِ غزال
اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دل نشیں

بوئے یمن آج بھی اس کی ہواؤں میں ہے !
رنگِ حجاز آج بھی اس کی نواؤں میں ہے !

مُقدمہ

حرفِ آغاز

پاکستان کے عدمِ استحکام کی نئی جہتیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ آغاز

'استحکامِ پاکستان' کی تحریر و تسوید کا آغاز اکتوبر ۸۵ء (صفر المظفر ۱۴۰۶ھ) میں بمقام طائف ہوا تھا اور اُس کی آخری سطریں ۱۷ فروری ۸۶ء کو بمقام لاہور سپردِ قلم ہوئی تھیں۔

اُس وقت صرف 'خیال' ہی نہیں پختہ ارادہ تھا کہ اُس کے دوسرے حصّے کی تالیف بھی فوراً ہی شروع کر دی جائے گی۔ چنانچہ کتاب کے آخر میں اس کا وعدہ بھی کر لیا گیا تھا۔ لیکن مختلف النّوع مستقل مصروفیات پر مستزاد بعض اچانک اور غیر متوقع حادثات کے باعث اس میں تاخیر ہوتی چلی گئی۔

اُدھر اوّل تو روزنامہ 'جنگ' کے جملہ ایڈیشنوں میں اشاعت کی بنا پر اس کے مضامین پہلے ہی بہت وسیع حلقے میں پھیل چکے تھے۔ پھر کتاب بھی نہایت قلیل مدت میں کثیر التّعداد لوگوں تک پہنچ گئی۔ لہٰذا فطری طور پر موعودہ حصّہ دوم کے لیے تقاضا شدید ہو گیا خصوصاً اس بنا پر کہ خود راقم نے کتاب کا اختتام ان الفاظ پر کیا تھا:

> "ہماری اب تک کی کُل گذارشات کا لبّ لباب اور حاصلِ کلام صرف یہ ایک جملہ ہے کہ:
>
> 'پاکستان کے استحکام کا واحد ذریعہ اسلامی انقلاب ہے'۔ . . . .
>
> اس مرحلے پر ایک نہایت اہم اور بنیادی سوال یہ سامنے آتا ہے کہ وہ اسلامی انقلاب کیسے آئے گا؟ اس کے اساسی لوازم کیا ہیں؟ بنیادی طریق کار کیا ہے؟ اور تکمیلی اقدامات کیا ہوں گے؟ بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اِن امور کی بھی تفصیلی وضاحت کی بھی ضرورت ہے کہ اسلامی انقلاب سے مراد کیا ہے؟ اور اس کے نتیجے میں جو سماجی،

معاشی اور سیاسی نظام وجود میں آئے گا اس کے اہم خد و خال کیا ہوں گے؟"

اِن حالات میں ایک ہی صورت ممکن العمل نظر آئی اور وہ یہ کہ دوبارہ ارضِ مقدّس ہی کا قصد کیا جائے اور وہیں "البلد الامین" کے کسی گوشے میں بیٹھ کر تحریر کا آغاز کر دیا جائے ـــــ پھر تکمیل ان شاء اللہ حسب سابق پاکستان میں بھی ہو جائیگی۔

اللہ کا شکر ہے کہ اُس نے اپنے کمال فضل وکرم سے یہ ارادہ پورا کرا دیا اور حضرتِ اکبرؔ کے اس شعر کے مصداق کہ ؎

منتشر رہتا ہے مکروہاتِ دنیا سے بہت   اس دلِ مضطر کو یا اللہ اطمینان دے!

کتاب کی تحریر و تسوید کے لیے جس امن و سکون کی ضرورت تھی وہ حرمِ مکّی میں میسّر آ گیا، بقول اقبالؔ ؎

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی   مرے جرمِ خانہ خراب کو ترے عفوِ بندہ نواز میں!

چنانچہ ـــــ آج بروز شنبہ بتاریخ ۹ نومبر ۱۹۸۶ء (سعودی عرب کے حساب سے ۷ ربیع الاوّل ۱۴۰۷ھ) بمقام مکّہ مکرمہ محض اللہ کی تائید و توفیق کے بھروسے پر قلم ہاتھ میں لے لیا ہے ـــــ اس دعا کے ساتھ کہ "پروردگار! مجھے شرحِ صدر کی دولت عطا فرما، میرے کام کو میرے لیے آسان فرما دے اور میری زبان (اور قلم) کی گرہ کھول دے تاکہ (میرے ہم وطن اور ہم مذہب) لوگ میری بات کو سمجھ سکیں" گویا بقول اقبالؔ ؎

میں ہوں صدف تو تیرے ہاتھ میرے گہر کی آبرو   میں ہوں خزف تو تُو مجھے گوہرِ شاہوار کر!

سب جانتے ہیں کہ راقم الحروف نہ مصنّف و مؤلف ہونے کا مدّعی ہے، نہ ادیب اور انشا پرداز ہونے کا دعویدار۔ بنا بریں اصحابِ نظر سے توقع ہے کہ وہ لغت و ادب کی غلطیوں اور انشاء اور اسلوب کی خامیوں سے صرفِ نظر کرتے ہوئے توجّہ کو بالکلیہ مفہوم و مدّعا ہی پر مرکوز رکھیں گے۔ مبادا مجھے بھی اپنے بزرگوں اور عزیزوں سے علّامہ اقبالؔ کے الفاظ میں شکوہ کرنا پڑے کہ ع "مرا یاراں غزل خوانے شمردند!"

وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ!

پاکستان کے عدمِ استحکام کی نئی جہتیں

اس کتاب کے پہلے حصّے میں تفصیل کے ساتھ واضح کیا جا چکا ہے کہ پاکستان کا عدمِ استحکام ع "یہ ہوائی کسی دشمن نے اُڑائی ہوگی" کے مصداق وہمی اور خیالی نہیں بلکہ حقیقی اور واقعی ہے اور اس میں اغیار اور اعداء کی ریشہ دوانیوں سے کہیں زیادہ دخل ہماری اپنی کوتاہیوں اور نااہلیوں کو ہے جن کی اصل جڑ اور بنیاد یہ ہے کہ ہم نے پاکستان جس مقصد کے لیے حاصل کیا تھا اُس کی جانب کوئی حقیقی اور واقعی، اور مؤثر اور نتیجہ خیز پیشقدمی نہیں کی (یعنی اسلام کی جانب کوئی قدم اٹھایا بھی تو محض علامتی اور ظاہری ٹیپ ٹاپ کی نوعیت کا) بلکہ ہم ہمہ تن آزادی کی مادی برکات سے بہرہ اندوز ہونے میں منہمک ہو گئے۔ اور اس کے ضمن میں مقابلہ و مسابقت اور تنافس و تکاثر نے بالکل 'آپا دھاپی' اور افراتفری (FREE FOR ALL) کی کیفیت پیدا کر دی ـــــ نتیجۃً ہماری وحدتِ ملی پارہ پارہ ہو گئی اور اس کی جگہ گروہی و طبقاتی، صوبائی و علاقائی اور نسلی و لسانی عصبیتوں کا دَور دَورہ ہو گیا۔

ہر دیکھنے والی آنکھ دیکھ رہی ہے اور ہر قلبِ حسّاس مضطرب ہے کہ گذشتہ ایک سال کے دَوران یہ کیفیت چار جمع چار آٹھ نہیں بلکہ چار ضرب چار سو کہ کے حساب سے بڑھی ہے۔ گویا بقول شعری ع "ترقی پہ ہے اضطرابِ محبت!"

چنانچہ وطن عزیز کے مختلف حصوں میں گذشتہ ایک سال کے دَوران بالعموم اور

پچھلے تین ماہ کے دَوران بالخصوص جو حالات و واقعات رُو نما ہوتے ہیں انہوں نے واقفانِ حال اور صاحبانِ احساس کی تشویش میں تو حد درجہ اضافہ کیا ہی ہے، بہت سے قلندرانِ حال مست" اور بے پرواہانِ مال مست" کو بھی پریشان کر دیا ہے ——— اور اس وقت ہر پاکستانی مسلمان خواہ امیر ہو یا غریب، پڑھا لکھا ہو یا اَن پڑھ اور بڑا ہو یا چھوٹا ملک و ملّت کے بارے میں شدید اندیشہ محسوس کر رہا ہے ——— یہاں تک کہ وہ "نفسِ مُطمئنّہ"، اور بقولِ خود "مقتدرِ اعلیٰ" بھی جو سرکاری تقریبات میں مسکراہٹوں کے پھول بکھیرتا اور لطیفوں کی پھلجھڑیاں چھوڑتا ——— گویا نیرو کے مانند بنسی بجاتا نظر آتا ہے ——— اور اس طرح ہر ممکن طریقے سے "سب اچھا ہے!" کا تاثر دیتا ہے پہلی بار یہ کہنے پر مجبور ہو گیا ہے کہ "حالات واقعتہً تشویشناک ہیں!" اگرچہ اس فوری اضافے کے ساتھ کہ "مگر اِن کا علاج تازہ الیکشن ہرگز نہیں ہے!" گویا اطمینان کی اصل اساس وُہی ہے کہ "ہنوز دلّی دُور است!" اور اسی بنا پر "ایں دفترِ بے معنیٰ غرقِ مئے ناب اولیٰ!" کی روش پر اصرار ہے!

تو آیئے کہ ذرا پاکستان کے حالات پر ایک طائرانہ نگاہ ڈال کر جائزہ لیں کہ پاکستان کے چاروں صوبے کس حال میں ہیں اور پاکستان کی سالمیت کی فصیل میں کہاں کہاں دراڑیں پڑ رہی ہیں:

سرحد

پاکستان کی شمال مغربی سرحد پر رُوس اور اُس کی کٹھ پتلی افغان حکومت کی جانب سے فضائی خلاف ورزیوں کا سلسلہ تو کئی سال سے جاری ہے، اِس سال کے دَوران براہِ راست بمباری کے بھی متعدد واقعات ہوئے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ 'جوابِ آں غزل' کا وہ عمل بالفعل شروع ہو گیا جس کی دھمکی کئی سال سے دی جا رہی تھی۔ چنانچہ ایک طرف پاکستان کے قبائلی علاقے میں روسی عمل دخل اور اثر و نفوذ کا سلسلہ پُوری شدّت کے ساتھ شروع ہو گیا اور روسی ہتھیاروں اور اسلحہ کی بھرمار ہو گئی اور دوسری جانب ایک قبائلی

سرداراور اس کے حواریوں کے ذریعے 'جوابی ہجرت' کا ڈرامہ بھی رچا لیا گیا، خواہ وہ محض ایک 'علامت' (SYMBOL) کے درجے ہی کی تھی۔

اس پر مستزاد یہ کہ بموں کے دھماکے اور دوسری تخریبی سرگرمیاں اب پشاور اور اس کے گردونواح کے علاقے کا معمول بن گئی ہیں اور اس علاقے کی صورتِ حال کی بالکل صحیح تعبیر ہے جو ایک حال ہی میں فوت ہونے والے سیاسی کارکن سے منسوب اِن الفاظ میں سامنے آئی ہے کہ "پشاور کا علاقہ بیروت نہیں بلکہ ڈبن رہا ہے!" ——— اِسی طرح افغان تخریب کاروں اور دہشت گردوں کی گرفتاری اور مہلک اسلحہ اور تباہ کن ساز و سامان کی برآمدگی کی خبریں اب جس تسلسل سے آرہی ہیں اُس کے پیش نظر یہ سوال ذہن میں بار بار اُبھرتا ہے کہ "اگر یہ سارا سامان استعمال ہو جاتا تو کیا ہوتا؟" ——— اور اس کے ساتھ ہی تحت الشعور میں یہ اندیشہ بھی سر اٹھاتا ہے کہ "یہ برآمدگیاں برف کے سمندری تودے (ICEBERG) کی صرف سطحِ سمندر سے اُوپر نظر آنے والی چوٹی (TIP) کی حیثیت رکھتی ہیں!" گویا ع "قیاس کن زگلستانِ من بہارِ مرا!"

اس پوری صورتِ حال پر تو یہ کہہ کر صبر کیا جا سکتا تھا کہ یہ سب کچھ افغان مہاجرین کو پناہ دینے اور مجاہدین افغانستان کے لیے کم از کم بیرونی امداد کے راستوں کو کھلا رکھنے کی قیمت ہے جو ہمیں بہرصورت ادا کرنی ہوگی۔ اس لئے کہ مسلمان مہاجرین کو پناہ دینا ہمارا دینی اور اخلاقی فرض ہے ——— اور افغان مجاہدین صرف اپنے ملک کی آزادی ہی کے لیے نہیں لڑ رہے ہیں بلکہ مارکسسٹ الحاد اور رُوسی استبداد کے سیلاب کی راہ کا کوہِ گراں بن کر خود پاکستان کے دفاع کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔ لہٰذا بات اگر صرف اس حد تک ہوتی تو ہرگز تشویشناک نہ ہوتی لیکن اس کے ساتھ ساتھ جب یہ بھی نظر آتا ہے کہ خان عبدالولی خاں کابل اور روس میں بیٹھ کر پوری بے باکی کے ساتھ نہ صرف یہ کہ پاکستان کی پالیسیوں پر تنقید کرتے ہیں بلکہ کھلم کھلا الزام عاید کرتے ہیں کہ پاکستان بھارت کے سکھ دہشت گردوں کی مدد کر رہا ہے ——— اور اس سب کے بعد پورے اطمینان اور نہایت آن بان کے ساتھ میلوں لمبے استقبالی جلوس کے جلو میں

پاکستان واپس تشریف لے آتے ہیں اور انہیں کوئی اندلیشہ نہیں ہوتا کہ ملک میں اُن سے کوئی باز پرس ہو سکتی ہے ——— تو لازماً تشویش ہوتی ہے کہ ہماری حکومت نے فضائی اور سرحدی خلاف ورزیوں کے معاملے میں تو اُس روایتی بنیے کا کردار جو ہر مرتبہ مار کھانے کے بعد یہی کہا کرتا تھا کہ "اب کے مار کے دیکھ!" اس لیے اختیار کیے رکھا کہ روس ایسی سپر پاور سے براہِ راست تصادم سے امکانی حد تک گریز کرنا چاہیے لیکن کیا وہ اس درجہ لاچار اور بے بس ہو چکی ہے کہ خود اپنے شہریوں سے بھی باز پرس نہیں کر سکتی! مزید برآں کیا عوامی سطح پر ہمارا جسدِ ملّی اتنا بے جان ہو چکا ہے کہ اس کے خلاف صریح جارحیت پر بھی کسی عوامی ردّ عمل کا اندلیشہ نہیں ہوتا! ——— اسی طرح جب وہ صاحب بھی جو جنابِ ضیاء الحق کے جاری کردہ 'نیم سیاسی' عمل کے ذریعے صوبہ سرحد کی وزارتِ علیا کے عہدے پر فائز ہوئے ہیں نہ صرف یہ کہ مجوّزہ کالا باغ ڈیم کے بارے میں بالکل وہی بات کہتے ہیں جو جنابِ سرحدی گاندھی اور اُن کے فرزند ارجمند اور جنابِ جی ایم سیّد اور اُن کے حواری کہتے ہیں بلکہ صوبائی حقوق و اختیارات کے ضمن میں کنفیڈریشن کا نعرہ لگانے والوں سے بھی دو ہاتھ آگے نکل جاتے ہیں تو لازماً خوف لاحق ہوتا ہے کہ کیا واقعۃً سرحد کا وہ غیور پٹھان جس نے چالیس سال قبل ریفرنڈم میں انڈین نیشنلزم کے علمبرداروں کو عبرتناک شکست دی تھی کسی ردِّ عمل کا شکار ہو کر علاقائیت اور صوبائیت کے خول میں بند ہو چکا ہے!!

پنجاب

آبادی کے لحاظ سے پنجاب پاکستان کا سب سے بڑا صوبہ ہے ——— اور غالباً یہ اسی 'بڑے پن' کے اِحساس کا نتیجہ ہے کہ وہاں کے لوگ اکثر و بیشتر اپنے آپ ہی میں مگن رہتے ہیں اور "اندلیشہ ہائے دُور و دراز" میں بآسانی مبتلا نہیں ہوتے' جس کے نتیجے میں "بدگمانی ہے عبث میری خوشی سے تمہیں!" کے مصداق چھوٹے صوبوں کے لوگوں کو کچھ بدگمانیاں فطری طور پر لاحق ہوتی ہیں جنہیں ملک و ملّت کے دشمن "کچھ تو ہوتے بھی ہیں الفت میں جنوں کے

آثار۔ اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا لیتے ہیں" کے مطابق بڑھا چڑھا اور نمک مرچ لگا کر اپنے مذموم مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنا لیتے ہیں۔ چنانچہ چھوٹے صوبوں میں یہ خیال عام پایا جاتا ہے کہ چونکہ پنجاب بہت خوشحال ہے اور اس خوشحالی میں اُس کے اپنے داخلی وسائل و ذرائع اور اس میں بسنے والوں کی محنت و مشقت یا اہلیت و لیاقت سے زیادہ حصّہ دوسرے صوبوں کے 'استحصال' کا ہے لہٰذا وہاں —" سب اچھا" کا سماں بندھا رہتا ہے —— حالانکہ واقعہ یہ ہے پاکستان کی صنعتی اور تجارتی دولت کا سب سے بڑا ارتکاز کراچی میں ہے' اور 'ہر قسم' کے پیسے کی سب سے زیادہ ریل پیل صوبہ سرحد میں ہے' پھر استحصالی طبقات جیسے کچھ اور جتنے کچھ پاکستان کے دوسرے صوبوں میں موجود ہیں ویسے اور اُتنے ہی پنجاب میں بھی ہیں اور محنت کش عوام' خواہ وہ ادنیٰ اور متوسط طبقے کے ملازمت پیشہ لوگ ہوں خواہ مزدوروں اور کاشتکاروں کے طبقے سے تعلق رکھتے ہوں جیسے اور جتنے دوسرے صوبوں میں ظلم و ستم کی چکّی میں پس رہے ہیں ویسے ہی اور اُتنے ہی پنجاب میں بھی پس رہے ہیں۔ اور اگرچہ اس اِمکان کی نفی نہیں کی جا سکتی کہ سب سے بڑا صوبہ ہونے کے ناطے پنجاب کے استحصالی طبقات نے خود اپنے صوبے کے پسماندہ عوام کے استحصال کے ساتھ ساتھ دوسرے صوبوں کا بھی استحصال کیا ہو' تاہم پوری پنجابی قوم کو استحصالی قرار دے دینا یقیناً زیادتی ہے جبکہ عمومی سکوت و سکون اور سیاسی جمود و تعطّل پنجاب کا مستقل وصف ہے!

پنجاب کے اس عمومی اور مجموعی وصف کے اصل اسباب کا سراغ لگانے کے لیے تو پنجاب کے طویل تاریخی پس منظر میں جھانکنا ہوگا۔ پاکستان کے موجودہ سیاسی تناظر میں اہل پنجاب کی "بے حسی" کا سبب اوّلاً تو 'بڑائی' کا وہ احساس ہے جس کا ذکر اُوپر ہو چکا ہے اور جو فی نفسہٖ بہت سرور انگیز اور نشہ آور ہے اور ثانیاً یہ کہ آخر وہ ایجی ٹیشن کریں تو کس کے خلاف؟ یہ دُہائی دیں تو کس کی؟ اور علیحدگی چاہیں تو کس سے؟ اس لیے کہ یہاں تو معاملہ وہ ہے کہ بقول "اے باد صبا ایں ہمہ آوردہ تست!" اور بقول

"دیکھا جو تیر کھا کے کمین گاہ کی طرف ۔۔۔ اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی!"

اور یہ 'دوست' کون ہیں؟ اوّلاً پاکستان کی مرکزی سول بیوروکریسی' جس میں ابتداء

ہندوستان کے دوسرے علاقوں سے آنے والے (مہاجرین) اور پنجاب سے تعلق رکھنے والے تقریباً برابر کے شریک تھے اور صوبۂ سرحد کا حصّہ بھی بقدر جثّہ موجود تھا جبکہ باقی دو صوبوں کی نمائندگی نہ ہونے کے برابر تھی۔ لیکن جیسے جیسے وقت گذرا مہاجرین کا تناسب کم ہوتا چلا گیا اور مرکزی بیوروکریسی میں غالب اور فیصلہ کن اکثریت اہلِ پنجاب ہی کی ہوتی چلی گئی! اور ثانیاً پاکستان کی افواج ——— جن کے 'جوان' تو تقریباً کُل کے کُل پنجاب بلکہ اس کے بھی صرف دو ڈویژنوں سے تھے' رہے 'آفیسرز' تو اُن کی بھی غالب اکثریت پنجاب سے تھی' اس کے بعد سرحد سے اور کسی قدر مہاجرین میں سے۔ گویا سندھ اور بلوچستان دونوں صوبوں کی پاکستانی افواج میں بھی کوئی نمائندگی نہ تھی۔

واضح رہے کہ یہاں نہ کسی کے معائب و محاسن کا میزانیہ (BALANCE SHEET) مرتب کرنا مقصود ہے' نہ کسی طبقے کو مطعون (CHARGE SHEET) کرنا مطلوب ہے بلکہ مقصود صرف یہ ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ پاکستان کے موجودہ سیاسی و انتظامی خلفشار (CHAOS) اور ملّی و ملکی اضمحلال و تزلزل (SHAKINESS) میں کون کون سے طبقات کے کس رویّے کے منفی اثرات کو دخل حاصل ہے' لہٰذا پاکستان کی مرکزی حکومت کے اعلیٰ سطح کے ملازمین اور پاکستان کی افواج کے جوانوں اور افسروں کی خدمات اور اُن کی شاندار کارکردگی کا ذکر نہیں کیا جارہا ہے ورنہ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ایک نوزائیدہ مملکت جو انتہائی بے سروسامانی کے عالم میں قائم ہوئی تھی اس کو ابتداءً مستحکم کرنے اور داخلی فتنوں اور خارجی حملوں سے بچا کر اپنے پاؤں پر کھڑا کر دینے میں ان دو طبقات کی محنت و مشقت اور لیاقت و قابلیت کو فیصلہ کُن دخل حاصل ہے۔ پھر یہاں بات مجموعی اعتبار سے کی جارہی ہے۔ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ پاکستان کے سول ملازمین اور فوجی افسران دونوں میں ایسی شخصیتیں پہلے بھی موجود رہیں' اور اب بھی خواہ "اَلنَّادِرُ کَالمَعْدُوم" ہی کے درجہ میں سہی لیکن بہرحال بالکل ناپید نہیں ہیں جن کے بارے میں پورے وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ ع "دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں!"

بہرحال موضوعِ زیرِ بحث کے اعتبار سے جس حقیقت کی جانب توجہ دلانی مطلوب ہے وہ

یہ ہے کہ پاکستان کی اوّلین مرکزی بیوروکریسی نے چونکہ نوآبادیاتی نظام میں افسری کی تربیت پائی تھی لہٰذا چند مستثنیٰ مثالوں کو چھوڑ کر اس میں رعونت ہی نہیں فرعونیت بھی تھی اور حاکمانہ ہی نہیں تحکمانہ ذہنیت بھی! جس کا شدید ردِّعمل پیدا ہوا اوّلاً مشرقی پاکستان میں اور ثانیاً بالخصوص وَن یُونٹ کے دَور میں مغربی پاکستان کے چھوٹے صوبوں بالخصوص سندھ میں!

نتیجۃً اوّلاً مشرقی پاکستان کے ہندوؤں اور ان کے نام نہاد مسلمان ایجنٹوں کو پورے مغربی پاکستان کے خلاف جذبات بھڑکانے کا موقع ملا اور بنگلہ دیش کے قیام کی راہ ہموار ہو گئی۔ اس لیے کہ اس وقت تک سنٹرل سول سروس میں پنجابیوں کے ساتھ ساتھ مہاجروں کی بھی معتدبہ تعداد موجود تھی ——— اور بعد ازاں یہی صورت مغربی پاکستان میں پیدا ہوئی جس کے نتیجے میں سندھی اور بلوچ عوام میں پنجابیوں کے خلاف شدید نفرت کا جذبہ پیدا ہو گیا اس لیے کہ اب سنٹرل سروسز میں پنجابیوں کو فیصلہ کن اکثریت حاصل ہو گئی تھی! پنجاب کے خلاف یہ عمومی ردِّعمل اگرچہ کسی درجہ میں سرحد میں بھی پیدا ہوا ۔ اور اس سے کسی قدر زائد بلوچستان میں بھی (زیادہ ہو گا کہ ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے بعد نیشنل عوامی پارٹی اور جمعیت العلماء کی جو کولیشن حکومت بلوچستان میں بنی تھی اس نے تمام پنجابی افسروں کو یکدم پنجاب واپس جانے کا حکم صادر کر دیا تھا) لیکن اس نفرت کا سب سے بڑا گڑھ سندھ بنا!

اور اس میں ہرگز کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ نفرت کی اس جلتی آگ پر تیل ہی نہیں پٹرول کا کام کیا بار بار لگنے والے مارشل لاز نے، اور اس کیفیت (PHENOMENON) کو منطقی انتہا تک پہنچا دیا جنرل ضیاء الحق کی طویل ترین فوجی حکومت نے جس سے پاکستان تاحال بھی کُلّی طور پر رُستگاری حاصل نہیں کر سکا ہے! نتیجۃً آج 'پنجابی' کا لفظ پاکستان کے تینوں چھوٹے صوبوں میں بالعموم اور سندھ میں بالخصوص 'گالی' کی حیثیت اختیار کر چکا ہے اور پاکستان بالفعل اُس خوفناک تباہی کے دہانے تک پہنچ گیا ہے جس کا اندیشہ راقم الحروف نے اپنے اُس خط میں ظاہر کیا تھا جو اُس نے اب سے ٹھیک چار سال قبل (دسمبر ۸۲ء میں) جنرل ضیاء الحق صاحب کی خدمت میں ارسال کیا تھا اور جو بعد ازاں روزنامہ 'جنگ' میں بھی (کسی قدر قطع وبرید کے ساتھ) شائع ہو گیا تھا اور ماہنامہ 'میثاق' میں بھی!

اپنے اُس خط میں راقم نے اپنا یہ مشاہدہ بھی بیان کیا تھا کہ :

"میرے اندازے میں سندھ میں 'سندھو دیش' کے لیے میدان پورے طور پر بالکل اسی طرح تیار ہو چکا ہے جس طرح مشرقی پاکستان میں 'بنگلہ دیش' کے لیے ہوا تھا۔ اور اب فرق صرف اتنا ہے کہ چونکہ مشرقی پاکستان ہم سے دُور اور علیحدہ تھا اس لیے مرکزی حکومت وہاں مؤثر کنٹرول نہ کر سکی اور سندھ چونکہ زمینی طور پر ملحق ہے لہٰذا یہاں ایسی کسی تحریک کو کچلا جا سکتا ہے ۔ لیکن میرے نزدیک اس عامل (FACTOR) پر انحصار سخت عاقبت نا اندیشی ہے !"

اور اس کے ساتھ پوری وضاحت سے متنبّہ کیا تھا کہ 'مارشل لاء کی طوالت اور سیاسی عمل کے مسلسل تعطل سے قومی و ملّی زندگی میں جو خلاء (VACUUM) پیدا ہوا ہے وہ پاکستان کے حق میں خودکشی کے مترادف (SUICIDAL) ہے' دوسری طرف 'اسلام' جس کے نام پر آپ ملک کی سیاسی گاڑی کو روکے کھڑے ہیں' اُس کے ضمن میں نہ صرف یہ کہ آپ نے ساڑھے پانچ سال کے عرصے میں کوئی مثبت اور نتیجہ خیز پیشقدمی نہیں کی بلکہ آپ کے بعض نیم دلانہ اقدامات نے اسلام کے CAUSE کو اُلٹا نقصان پہنچایا ہے ۔ بنابریں جلد از جلد مارشل لاء کی بساط لپیٹیے اور ملک کی سیاسی گاڑی کو جمہوری خطوط پر آگے بڑھنے کا موقع دیجیے ——— اس ضمن میں راقم نے بہ " نوا را تلخ ترمی زن چوں ذوقِ نغمہ کم یابی ! " کے مطابق یہاں تک عرض کر دیا تھا کہ :

مجھے اپنے ذاتی مشاہدات و معلومات اور حالات کے تجزیئے اور جائزے سے شدید اندیشہ لاحق ہے کہ مستقبل کا مؤرخ کہیں یہ نہ لکھے کہ ۱۹۴۷ء میں پاکستان کے نام سے مسلمانوں کی جو سب سے بڑی مملکت قائم ہوئی تھی' اسے اوّلاً تو ۱۹۷۱ء میں دولخت کیا ایک شرابی اور زانی ٹولے نے اور پھر اس کے مزید حصے بخرے ہوئے (یعنی (BALKANISATION) کا حادثہ رونما ہوا ایک پابند صوم و صلوٰۃ اور دیندار اور پرہیزگار شخص کے ہاتھوں !! ——— معاذ اللہ ! ثم معاذ اللہ !"

قصہ مختصر یہ کہ پنجاب کے حصّے میں جو بدنامی آئی وہ اصلاً تو بیوروکریسی کے غلط رویے اور مارشل لاء کے تسلسل اور طوالت کی پیداوار ہے' اگرچہ اس سے قطع نظر کہ صحیح حقائق و واقعات تو اللہ ہی کے علم میں ہیں' بہر حال نظری طور پر اس امکان کو ردّ نہیں کیا جا سکتا کہ

پنجابی افسر شاہی اور مارشل لا حکام کی بدعنوانیوں کے طفیل پنجاب کے کچھ لوگوں یا چند خاندانوں نے ناجائز فائدے بھی حاصل کیے ہوں لیکن پاکستان کے مستقبل کے اعتبار سے جو چیز نہایت تشویشناک ہے وہ یہ کہ پاکستان کے اندرونی معاملے اور بین الصوبائی مقدمے میں ملک کا سب سے بڑا صوبہ 'مدعا علیہ' کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ جس کے نتیجے میں پنجاب کی عوامی نفسیات پر 'مدافعانہ' رنگ غالب آگیا ہے اور حرکت و اقدام سے گریز پنجاب کی طبیعتِ ثانیہ بن گئی ہے۔ چنانچہ وہاں جو حرکت بالعموم نظر آتی ہے وہ 'ان چہروں پہ جو سُرخی نظر آتی ہے سرِ شام۔ یا غازہ ہے یا ساغر و مینا کی کرامات!' کے مصداق اکثر و بیشتر صرف 'شغل میلہ' کی نوعیت کی ہوتی ہے۔ ورنہ کسی سنجیدہ سماجی یا سیاسی تحریک میں پنجاب صرف اس وقت شامل ہوتا ہے جب کسی دوسرے علاقے کے لوگ اُسے شروع کر کے نقطۂ عروج کے قریب تک پہنچا دیں۔

یہی وجہ ہے کہ ۱۹۸۳ء کی ایم آر ڈی کی تحریک پنجاب میں بالکل ناکام ہو گئی تھی نتیجۃً اس نے صرف سندھ اور اس کے بھی دیہی علاقے کی شورش کی صورت اختیار کر لی تھی پھر آلنسہ بے نظیر بھٹو کی آمد پر پنجاب میں استقبال کا 'شغل میلہ' تو بھرپور انداز میں ہوا لیکن ۱۴ اگست ۸۶ء کو مختصر سی ہل چل کے سوا پنجاب میں کوئی عوامی تحریک نہیں چلی اور ایک مرتبہ پھر سندھ کے بعض دیہی علاقے ہی کل ہنگامے کا مرکز بن کر رہ گئے۔ اور اگرچہ اس حالیہ ناکامی کے بعد مس بھٹو نے بہت ٹھنڈے اور حقیقت پسندانہ طرزِ عمل کا مظاہرہ کیا ہے اور وہ پوری سنجیدگی اور تندہی کے ساتھ خاص طور پر پنجاب میں اپنی تنظیم کی صفوں (CADRES) کو درست اور منظم کرنے کی کوششوں میں لگی ہوئی ہیں۔ تاہم ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ مستقبل قریب میں پنجاب کو جمہوریت کی کلی و کامل بحالی کے لیے کسی مؤثر سیاسی تحریک کے لیے آمادہ کیا جا سکے گا یا نہیں! اور جیسے کہ پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے پنجاب کا یہ سیاسی جمود اور قوم و وطن کے عظیم تر معاملات کے ضمن میں بے حسی اور لاتعلقی (INDIFFERENCE) کی روش پاکستان کے مستقبل کے لیے فی نفسہٖ بھی مضر اور خطرناک ہے۔ اس لیے کہ چھوٹے صوبوں کے عوام میں اس کی بنا پر

پنجاب سے عمومی مایوسی اور بدظنی پیدا ہو رہی ہے اور خصوصاً سندھ میں تو اس کا رد عمل بہت شدید ہے ——— مزید برآں اس کا بھی شدید خطرہ موجود ہے کہ اگر پنجاب کسی طرح حرکت میں نہ آیا تو مس بھٹو اور ان کی پیپلز پارٹی کا سندھی حصہ بھی قومی سیاست کے میدان سے پسپائی اختیار کر لیں اور صوبائیت کے خول میں بند ہو کر سندھی نیشنلزم کے تیز دھارے میں بہہ جائیں۔ اور اگر خدانخواستہ ایسا ہو گیا تو اس کے نتائج پاکستان کے حق میں بہت خوفناک ہوں گے!

پنجاب کے اس روایتی سکوت و سکون کے پس منظر میں وہ دو واقعات بہت نمایاں ہو کر سامنے آئے ہیں جو گذشتہ دو تین ماہ کے دوران رونما ہوئے اور جن سے ملک و ملت کے مستقبل کے ضمن میں نئے شکوک و شبہات نے جنم لیا ہے:

ایک پنجاب کے موجودہ برسرِ اقتدار لوگوں کی باہمی رسہ کشی ہی نہیں باضابطہ چھینا جھپٹی جس نے چالیس سال قبل کی اس دولتانہ ممدوٹ کشمکش کی یاد تازہ کر دی ہے جس کے نتیجے میں پاکستانی سیاست کی گاڑی پہلی بار دستوری و قانونی پٹڑی سے اتری تھی اور حکومت پر بیوروکریسی کے فیصلہ کن غلبے کی راہ ہموار ہوئی تھی ——— اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پنجاب کے چوہدریوں کو تا حال ملک و ملت کو درپیش عظیم تر مسائل کا کوئی شعور و ادراک حاصل نہیں ہوا اور ان کی عظیم اکثریت کی سوچ زیادہ تر خالص ذاتی اور اس سے آگے صرف خاندانی، گروہی اور طبقاتی مفادات اور مصلحتوں کے گرد گھومتی ہے ——— اور ظاہر ہے کہ ملک کے سب سے بڑے صوبے کے حکمران طبقے (RULING ELITE) کی یہ کیفیت ملکی استحکام کے نقطۂ نظر سے ہرگز قابلِ اطمینان نہیں ہے!

دوسرا اور فوری اعتبار سے کہیں اہم تر معاملہ ان شیعہ سنی فسادات کا ہے جو محرم الحرام اور صفر المظفر کے دو مہینوں کے دوران لاہور سمیت پنجاب کے متعدد شہروں اور قصبوں حتیٰ کہ دیہات تک میں ہوئے اور جن سے بلاشبہ پاکستان کے عدم استحکام کی داستان میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا ہے۔ اس لیے کہ اگرچہ محرم کے جلوسوں کے ضمن میں

معمولی نوعیت کی تلخیاں تو ہمیشہ کا معمول رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جیسے ہی ماہ محرم قریب آتا ہے۔ امن کمیٹیاں بھی بننی شروع ہو جاتی ہیں اور وحدت و اتحاد کے درس بھی نشر ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس سال پورے پنجاب میں بالعموم اور صوبائی دارالحکومت لاہور میں بالخصوص جو کچھ ہوا اُسے کسی فوری یا وقتی اشتعال کا مظہر قرار دینا یا حد درجہ سادہ لوحی کا نتیجہ ہو سکتا ہے یا خالص مصلحت پرستانہ خود فریبی کا شاخسانہ۔ اس لیے کہ یہ فسادات بدیہی طور پر ایک گہری سازش کا نتیجہ تھے اور بظاہر احوال تو یہی نظر آتا ہے وہ سازش بھی کلیتہً 'ساختۂ پاکستان' نہیں تھی بلکہ باہر سے درآمد شدہ تھی۔ واللہ اعلم!

بہر حال اسباب و علل اور نتائج و عواقب کی تفصیلی بحث سے قطع نظر' یہ امر بالکل واضح ہے کہ ماضیٔ قریب میں اوّلاً کراچی، پھر کوئٹہ اور گذشتہ دو ماہ کے دوران پاکستان کے سب سے بڑے صوبے کو وسیع ترین پیمانے پر لپیٹ میں لینے والی اس فرقہ وارانہ کشیدگی سے پاکستان کے عدم استحکام میں ایک بالکل نئی جہت (DIMENSION) کا اضافہ ہو گیا ہے عیاذاً باللہ

بلوچستان

پاکستان کی چالیس سالہ تاریخ کے دوران بلوچستان میں متعدد بار سیاسی بے چینی پیدا ہوئی۔ اور کم از کم دو مرتبہ وہاں بغاوت کی سی صورت بھی ظاہر ہوئی اور قبائلی شورش کو دبانے کے لیے قوت کا استعمال کرنا پڑا۔ اور نہ صرف فوجی کارروائی بلکہ بعض مواقع پر بمباری تک کی نوبت آئی ——— لیکن اِدھر چند سال سے بلوچستان میں بھی خاموشی تھی، اور ماسوائے اس کے کہ اُس کے دو اہم سیاسی رہنما یعنی سردار خیر بخش مری اور سردار عطاء اللہ مینگل خود اختیار کردہ جلاوطنی کی زندگی گذار رہے ہیں اور کبھی کبھی ایسی خبریں بھی سننے میں آجاتی ہیں کہ افغانستان میں کئی ہزار تربیت یافتہ بلوچ گوریلے پاکستان کی طرف مارچ کرنے کے لیے تیار کھڑے ہیں' اس عرصے کے دوران اندرونِ بلوچستان نہ کوئی سیاسی ہلچل پیدا ہوئی نہ کوئی قبائلی یا عوامی شورش! —— اور شاید یہ بھی پنجاب ہی کے مانند کسی نمایاں

سیاسی حرکت کے فقدان کا نتیجہ تھا کہ بلوچستان میں بھی کچھ عرصہ قبل ملک و ملت کے دشمنوں نے مذہبی فساد یعنی شیعہ سنی تصادم کا مکروہ ترین راستہ اختیار کیا تھا جس کے نتیجے میں کوئٹہ کی سرزمین انسانی خون سے لالہ رنگ ہو گئی تھی۔

لیکن حال ہی میں کوئٹہ میں دو نسلی قومیتوں (ETHNIC GROUPS) یعنی پٹھانوں اور بلوچوں کے مابین جس خونریز تصادم کی صورت پیدا ہوئی جس کے باعث طویل عرصہ تک کرفیو نافذ رہا اس نے بھی اسلام کے نام پر بننے والی دولت خداداد پاکستان کے مستقبل کے بارے میں شدید اندیشے پیدا کر دیئے ہیں اور گویا خطرے کی گھنٹی بجا دی ہے کہ پاکستان کی اصل اساس اور اس کے قیام کی واحد وجہ جواز یعنی 'اسلام' کے جانب کوئی حقیقی اور واقعی پیشقدمی نہ ہونے کے باعث بقول "خانۂ خالی را دیو می گیرد!" کے مصداق نسلی و لسانی اور صوبائی و علاقائی عصبیتوں کے جو بیج بوئے گئے تھے اب ان کی فصل پک کر تیار ہو گئی ہے۔ اور اگر اس صورت حال میں کوئی فوری اور انقلابی قسم کی تبدیلی نہ آئی اور اسلام کے جانب فیصلہ کن پیشقدمی نہ ہوئی تو کیا عجب کہ بفحوائے الفاظ قرآنی: "وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيبٌ" (سورۂ شوریٰ آیت ۱۷، ترجمہ: "اور تمہیں کیا معلوم، شاید کہ وہ معیّن گھڑی قریب ہی آ چکی ہو") اسلام سے روگردانی اور اللہ سے کیے ہوئے وعدوں کی خلاف ورزی کی آخری سزا کا وقت آن ہی پہنچا ہو! فاعتبروا یا اولی الابصار!

سندھ

رہا صوبۂ سندھ تو اس کا معاملہ راقم کے نزدیک دوسرے تمام صوبوں سے علیحدہ اور منفرد نوعیت کا حامل بھی ہے ——— اور اس کے ساتھ ساتھ سب سے زیادہ نازک اور پیچیدہ بھی ہے اور پاکستان کے مستقبل کے اعتبار سے سب سے بڑھ کر اہم اور فیصلہ کن بھی! ——— چنانچہ راقم کے اندازے کے مطابق آئندہ چند سال کے

دوران میں نہ صرف یہ کہ پاکستان کی قسمت اور اس کے ضمن میں "TO BE OR NOT TO BE!" کا فیصلہ سرزمین سندھ میں ہوگا بلکہ خود سندھ کی سعادت وشقاوت کا آخری فیصلہ بھی ہوجائے گا کہ آیا برّعظیم پاک وہند کا یہ 'اوّلین' باب الاسلام' جو پہلی صدی ہجری کے اواخر میں صنم خانۂ ہند میں توحیدِ ربّانی اور حریّت واخوّت ومساواتِ انسانی کے انقلاب آفرین پیغام کا 'مَدخل' (یعنی داخل ہونے کی جگہ) بنا تھا، پندرھویں صدی ہجری کے آغاز میں اسلام کا 'مخرج' (یعنی نکلنے کی جگہ یا 'EXIT') بلکہ 'مدفن' بنتا ہے اور اس طرح چودہ سو سال بعد راجہ داہر کی صُلبی ومعنوی اولاد ابوالقاسم محمّد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی رُوحانی ذرّیت اور محمّد بن قاسم رحمۃ اللہ علیہ کا نام ادب واحترام اور فخر وامتنان کے ساتھ لینے والوں سے بھرپور انتقام لینے میں کامیاب ہوجاتی ہے یا یہ قطعۂ ارضی جس کی آغوش میں نہ صرف یہ کہ عام روایت کے مطابق بہت سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام رحمہم اللہ محوِ استراحت ہیں بلکہ عصرِ حاضر کے عظیم محقّق وسکالر ڈاکٹر حمید اللہ بالقابہ کی تحقیق کے مطابق جسے خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی قدمبوسی کا شرف حاصل ہوا تھا[1]، اوّلاً پاکستان، پھر برّعظیم پاک وہند اور بالآخر پورے عالم انسانی میں اسلام کی نشأۃ ثانیہ اور غلبۂ دینِ حق کے نقطۂ آغاز کی صورت اختیار کرتا ہے! بفحوائے الفاظ قرآنی: "فَسَتُبْصِرُ وَيُبْصِرُونَ بِأَيِّكُمُ الْمَفْتُونُ" (سورۃ قلم آیت ۵، ۶ ترجمہ: "عنقریب تم بھی دیکھ لوگے اور یہ بھی دیکھ لیں گے کہ تم میں سے کون بھٹک گیا تھا") اور بقول اقبال ؎

دیکھیے اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا   گنبدِ نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا!

---

[1] یہ بات محترم ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے چند سال قبل سندھ یونیورسٹی جام شورو کے 'انسٹی ٹیوٹ آف سندھالوجی' میں ایک لیکچر کے دوران فرمائی تھی اور اس کی تفصیل یہ بیان کی تھی کہ بعثت سے قبل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم ہر سال جزیرہ نمائے عرب کے مشرقی ساحل پر منعقد ہونے والے تجارتی میلوں میں شرکت فرمایا کرتے تھے، — اور ایک سال آپؐ نے وہاں سے آگے بھی سفر کیا اور ساحلِ سندھ کے کسی میلے میں شرکت فرمائی۔ — واللہ اعلم —

اس میں ہرگز کوئی شک نہیں ہے کہ اِس وقت سندھ بحیثیت مجموعی نہایت مایوس کن منظر پیش کر رہا ہے۔ چنانچہ اندرونِ سندھ کی حد تک میرے وہ الفاظ جو میں نے چار سال قبل ضیاء الحق صاحب کے نام خط میں تحریر کیے تھے کہ: "میرے اندازے میں سندھ میں 'سندھو دیش' کے لیے میدان پورے طور پر بالکل اسی طرح تیار ہو چکا ہے جس طرح مشرقی پاکستان میں 'بنگلہ دیش' کے لیے ہوا تھا!" جنہیں اُس وقت مخالفوں نے خللِ دماغی کا نتیجہ قرار دیا تھا اور دوستوں نے شدّتِ احساس کا مظہر، آج ایک نوشتۂ دیوار کی صورت اختیار کر چکے ہیں۔ اس لیے کہ اِن چار سالوں کے دوران انگریزی زبان کے محاورے کے مطابق بہت سا پانی دریائے سندھ میں بہہ چکا ہے' اور سندھی نیشنلزم کا ننھا مُنا پودا ایک تناور درخت کی صورت اختیار کر گیا ہے! ——— اور بنگلہ نیشنلزم کے مقابلے میں اس سندھی نیشنلزم کا زیادہ تکلیف دہ اور اذیت بخش پہلو یہ ہے کہ چونکہ مشرقی پاکستان مغربی پاکستان سے زمینی اعتبار سے منقطع بلکہ منفصل تھا اور اس کی علیحدگی نسبتاً آسان تھی۔ لہٰذا وہاں صرف 'حقوق' کا نعرہ کافی تھا اور دین و مذہب کی جڑوں پر تیشہ چلانے کی زیادہ ضرورت نہ تھی لہٰذا وہاں کی علیحدگی کی تحریک میں الحاد وارتداد کا اثر و نفوذ اتنا نہ تھا جتنا موجودہ سندھی نیشنلسٹ تحریک میں ہے۔ اور جی ایم سیّد اور اُن کے حواریوں کی ذہانت کو داد دینی پڑتی ہے کہ انہوں نے ابتداء ہی میں اندازہ کر لیا تھا کہ سندھ میں محض حقوق کا نعرہ مطلب برآری کے لیے کافی نہ ہوگا اور پاکستان کو توڑنے اور سندھ کو "آزاد" کرانے کے لیے دین و مذہب کی جڑ کاٹنی ضروری ہے ——— اور آج اُن کی رُبع صدی سے زیادہ کی محنت و کوشش کا یہ نتیجہ نگاہوں کے سامنے ہے کہ قدیم سندھیوں کی نوجوان نسل کا بہت بڑا حصّہ نہ صرف یہ کہ مذہب سے برگشتہ ہو کر الحاد و مادیت کی گود میں چلا گیا ہے بلکہ سندھی نیشنلزم اور مارکس کے ڈایالیکٹیکل میٹریلزم (DIALECT-ICAL MATERIALISM) کا علمبردار بن کر میدانِ عمل میں آ گیا ہے! اور نوبت باینجا رسید کہ اب اندرونِ سندھ نوجوانوں کی محفلوں اور مجلسوں میں پاکستان یا اسلام کا نام لینا بھی "لانا ہے جوئے شیر کا!" کا مصداق بن چکا ہے! چنانچہ ۹ر نومبر ۸۶ء کے اخبارات میں آنے

بے نظیر بھٹو کے انٹرویو پر جو شہ سرخی لگی ہے' یعنی "احساسِ محرومی کی وجہ سے سندھ علیحدگی پسندوں کے ہاتھوں کھلونا بن گیا ہے!" اور پھر متن میں جو الفاظ نقل ہوتے ہیں یعنی "سندھ کی صورتِ حال انتہائی سنگین ہے!" اور "اب جو بھی فیڈریشن کی بات کرتا ہے اسے پنجابی ایجنٹ کہا جاتا ہے!" اُن سے سندھ کی صورتِ حال کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے (واضح رہے کہ مس بھٹو خود سیکولر سیاست کی علمبردار ہیں لہٰذا اُن کی ساری سوچ 'احساسِ محرومی' اور 'فیڈریشن' ہی کے گرد گھومتی ہے اور مذہب سے بُعد اور دین سے انحراف کے ضمن میں کسی فکر یا تشویش کی اُن سے توقع نہیں کی جا سکتی!)

اندرونِ سندھ کی اِس کیفیت کا چونکہ راقم الحروف کو کئی سال سے پوری شدت کے ساتھ ادراک و شعور حاصل تھا لہٰذا بحکم "رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج!" کے مصداق اس کا صدمہ راقم کے وجود کی رگ و پے میں سرایت کیے ہونے کے باوجود شعور کی سطح پر نمایاں نہ رہا تھا ——— کہ "سہ دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز۔ پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا!" کے مصداق راقم کے قلب و ذہن اور احساس و شعور پر ایک بم گرنے کی سی کیفیت پیدا ہوئی کراچی اور حیدر آباد میں واقع ہونے والے پٹھان مہاجر تصادم سے جس میں وحشت و بربریت اور سفاکی و سنگدلی کی ایسی ایسی مثالیں سامنے آئیں کہ نہ صرف پندرہ سال قبل کے مشرقی پاکستان کے زخم ہرے ہو گئے بلکہ ۱۹۴۷ء کی یادیں تازہ ہو گئیں! چنانچہ راقم کا واقعی احساس یہ ہے کہ بالکل ایسے جیسے سقوطِ مشرقی پاکستان کے حادثہ فاجعہ کے بعد آنجہانی اندرا گاندھی نے کہا تھا کہ "ہم نے دو قومی نظریے کو خلیج بنگال میں غرق کر دیا ہے!" اسی طرح اگر پاکستان کا کوئی دشمن اور بدخواہ اُن واقعات کو جو عروس البلاد کراچی میں اکتوبر ۸۶ء کے آخری اور نومبر کے ابتدائی ایام میں پیش آئے' نظریہ پاکستان کے تابوت کی 'آخری میخ' سے تعبیر کرے تو "خاکم بدہن' بحکم "آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں!" کے مصداق اُسے اِس کا حق حاصل ہو گا۔ اس لیے کہ اِس سے قطع نظر کہ یہاں بھی تصادم ایک نسلی اور ایک لسانی قومیت کے مابین ہوا اور نسلی اور لسانی عصبیتیں اصلاً وحدتِ ملی کے منافی اور نظریۂ پاکستان کی ضد ہیں' اس معاملے کا انتہائی اذیت بخش اور تکلیف دہ اور حد

دوسرا مایوس کن پہلو جس کی بنا پر اسے 'نظریہ پاکستان' کے تابوت کی آخری کیل قرار دیا جا سکتا ہے، یہ ہے کہ یہاں وہ لوگ ایک 'لسانی قومیت' کی شکل میں سامنے آتے، یا لائے گئے، جو ع "ہے ترکِ وطن سنتِ محبوبِ الٰہی!" پر عمل پیرا ہو کر محض اسلام کے نام پر ہندوستان کے کونے کونے سے ہجرت کر کے پاکستان آئے تھے۔ اور جنہوں نے رنگ و نسل، شکل صورت، وضع قطع اور تہذیب و ثقافت کے جملہ امتیازات کو نظر انداز کر کے اُس ملک کا رُخ کیا تھا جو اسلام کے نام پر وجود میں آ رہا تھا! اور اُن علاقوں کو خیر باد کہہ دیا تھا جن میں وہ پُشت ہا پُشت سے آباد تھے، جہاں اُن کے جدّی و پشتی مکان اور آباؤ اجداد کی قبریں تھیں اور جہاں کی گلی کوچوں سے اُن کے بچپن کی یادیں وابستہ تھیں! ——

غور کا مقام ہے کہ اگر یہ لوگ بھی قیامِ پاکستان کے چالیس سال بعد حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر یا کسی رَدِّ عمل کا شکار ہو کر یہ مطالبہ کرنے لگیں کہ اُن کے جُداگانہ تشخص کو تسلیم کر کے انہیں پاکستان کی پانچویں قومیت کا درجہ دے دیا جائے تو کیا یہ مریض کی آخری ہچکی کے مترادف نہیں ہے؟ اور کیا 'نظریہ پاکستان' کی نفی کی کوئی اس سے بھی زیادہ افسوسناک اور مایوس کن صورت ممکن ہے! —— بقول غالب ؎

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے! کیا خوب! قیامت کا بھی ہوگا کوئی دن اور!

الغرض! پاکستان کے چاروں صوبوں کے حالات اس وقت سخت ناگفتہ بہ ہیں اور بظاہر احوال سے "کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ کوئی امید بر نہیں آتی!" کے مصداق بچاؤ کی کوئی صورت اور اُمید کی کوئی کرن کسی جانب سے نظر نہیں آتی اور جسے کبھی 'مِلّتِ اسلامیہ پاکستان' کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا آج ع "یہی ہے مرنے والی امتوں کا عالمِ پیری!" کی تصویر نظر آ رہی ہے۔ اس تناظر میں کشمیر اور راجستھان میں بھارتی افواج کی نقل و حرکت اُن مردار خور پرندوں کا نقشہ پیش کر رہی ہے جو کسی قریب المرگ حیوان یا انسان کے آس پاس اُس کی موت کے انتظار میں منڈلانا شروع کر دیتے ہیں!

لیکن —— بفحوائے الفاظِ قرآنی: "لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ" (سورۃ زمر آیت ۵۳، ترجمہ "اللہ کی رحمت سے مایوس مت ہو!") اور "وَ مَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ

رَبِّہٖۤ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ" (سورۃ حجر آیت ۵۶ ترجمہ: اور اپنے رب کی رحمت سے سوائے گمراہ لوگوں کے اور کون مایوس ہو سکتا ہے!" اور" وَلَا تَایْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰہِ ط اِنَّہٗ لَا یَایْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰہِ اِلَّا الْقَوْمُ الْکٰفِرُوْنَ" (سورۃ یوسف آیت ۸۷، ترجمہ" اللہ کے لطف و کرم سے نا امید نہ ہو اس لیے کہ اللہ کے لطف و کرم کے سوائے کافروں کے کوئی اور نا امید نہیں ہوتا!" ——— اور بقول اقبال ؎

نہ ہو نومید، نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے
امیدِ مردِ مومن ہے خدا کے راز دانوں میں!

——— ہمیں یہی ہدایت ہوئی ہے کہ مایوس اور نا امید نہ ہوں۔ اور حالات خواہ بظاہر کتنے ہی نا مساعد و ناموافق نظر آئیں اور خواہ مایوسی کے اندھیارے ہر سُو چھا گئے ہوں اور امید کی کوئی کرن کسی جانب دکھائی نہ دے رہی ہو اور بچ نکلنے کی کوئی راہ کسی طرف نظر نہ آ رہی ہو، ہمیں حکم یہی ہے کہ مایوس اور بد دل ہو کر سعی و جہد سے کنارہ کش نہ ہوں بلکہ اللہ کے فضل و کرم کی امید ——— اور اُس کی تائید و توفیق کے بھروسے پر زندگی کے آخری سانس تک اللہ کے کلمے کی سربلندی اور اُس کے دین کی اقامت کے لیے تن من دھن لگاتے چلے جائیں خواہ یہ انگریزی محاورے کے مطابق "HOPING AGAINST HOPE" ——— ہی قرار پائے۔ گویا بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

اگرچہ بُت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکمِ اذاں، لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ!

تاکہ اگر ان مساعی کا کوئی ظاہری نتیجہ بر آمد نہ ہو تب بھی کم از کم "مَعْذِرَۃً اِلٰی رَبِّکُمْ" کی صورت تو بن ہی جائے ——— اور کیا عجب کہ کوئی نتیجہ بھی بر آمد ہو اور" وَلَعَلَّھُمْ یَتَّقُوْنَ" کی کوئی صورت بھی بن ہی جائے! (سورۃ اعراف آیت ۱۶۴ ترجمہ:" اور یاد کرو جب اُن کی قوم کے ایک گروہ نے کہا تھا کہ ایسی قوم کو وعظ و نصیحت (میں دقت و قوت ضائع) کیوں کر رہے ہو جسے اللہ تعالیٰ (قطعی طور پر) ہلاک کر کے رہے گا یا کوئی شدید عذاب دے کر رہے گا؟" تو انہوں نے جواب دیا تھا:" تاکہ ہم رب کے حضور میں عذر تو پیش کر سکیں! اور کیا عجب کہ یہ لوگ تقویٰ کی روش اختیار کر ہی لیں!")

اور اگرچہ ان سطور کے راقم کو اس سے ہرگز انکار نہیں ہے کہ ارضِ پاکستان سے

اُس کی دلچسپی دنیوی اور مادّی بنیاد پر بھی ہے' اس لیے کہ گو اِس ملک کے پورے طول و عرض میں ایک مکان کے سوا اس کی نہ کوئی زمین ہے نہ جائداد' اور نہ کوئی ذاتی کاروبار ہے نہ کسی کاروبار میں حصّہ داری یا سرمایہ کاری (INVESTMENT)

تاہم اس کے اہل و عیال بھی یہیں ہیں اور اعزّہ اقارب بھی —— لیکن اس ارضِ پاک سے اُس کی اصل دلچسپی اس اعتبار سے ہے کہ یہ اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کا گہوارہ اور دینِ حق کی عالمی سربلندی کا نقطۂ آغاز بنے بقول جناب نعیم صدیقی ؎ "اسے آندھیو سنبھل کے چلو اس دیار میں سامید کے چراغ جلاتے ہوئے ہیں ہم!" اور خدا گواہ ہے کہ تیرہ چودہ برس کی عمر سے جب اُس نے 'نیم شعوری' دَور میں تحریکِ پاکستان میں حصّہ لیا تھا، آج چوّن برس کی عمر تک اُس کی زندگی کے چالیس سالوں کے دوران بحمدللہ اس کا سینہ اُس "آرزو" سے آباد رہا ہے جس کے بارے میں علامہ اقبال نے فرمایا تھا کہ ؎

آرزو اوّل تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں ۔۔۔۔۔ اور ہو جائے تو مر جاتی ہے یا رہتی ہے خام!

اور آج بھی اگرچہ خارجی حالات "HOPING AGAINST HOPE" کا نقشہ پیش کر رہے ہیں اللہ کا شکر ہے کہ اُس کے نہاں خانۂ قلب کی کیفیت یہی ہے کہ ؎

مسلم استی سینہ را از آرزو آباد دار ۔۔۔۔۔ ہر زماں پیش نظر لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَاد دار!

لہٰذا —— پاکستان کے 'عدمِ استحکام' کی تکرار اور پاکستان کے موجودہ حالات کی بھیانک تصویر کشی کا مقصد نہ سنسنی خیزی ہے نہ یاس و نومیدی کی تخم ریزی' بلکہ مقصود صرف یہ ہے کہ ملک و وطن اور دین و مذہب کے مخلصوں اور بہی خواہوں کی غیرت اور حمیّت کو للکارا جائے اور انہیں ع "معمارِ حرم! باز بہ تعمیرِ حرم خیز!" کے انداز میں از سرِ نو کمرِ ہمّت کس کر ملک و ملّت کی تعمیرِ نو کی جدّوجہد پر آمادہ کیا جائے —— اور اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ صورتِ حال کا بے لاگ تجزیہ کیا جائے، حقائق کا ہمّت کے ساتھ مواجہہ کیا جائے اور پھر مرض کی ظاہری علامات اور ثانوی پیچیدگیوں سے نبرد آزما ہونے اور مریض کی فوری تکالیف اور شکایات کو رفع کرنے کے ساتھ ساتھ اصل توجّہ کو بنیادی خرابی کی تشخیص اور اصل مرض کے ازالے پر مرکوز کر دیا جائے۔ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ!

مکّہ مکرمہ —— ۹ ربیع الاوّل ۱۴۰۷ھ مطابق ۱۱ نومبر ۱۹۸۶ء

مسئلهٔ سنده

تمہید

- قدیم سندھی مسلمانوں کی عمومی بے چینی کے عناصر ثلاثہ

مہاجرین کا ردِّعمل

- جنرل ضیاء الحق کا دورِ حکومت اور موجودہ صورتحال

تمہید

فلسفۂ وجود (جس کی ایک تعبیر ہمہ اوست ہے، دوسری وحدت الوجود اور تیسری وحدت الشہود) کی نزاکتوں اور پیچیدگیوں کی جانب حضرت اکبر الہ آبادی نے اپنے ایک فلسفیانہ اور عارفانہ شعر میں یوں اشارہ کیا ہے کہ ؎

"جہاں ہستی ہوئی محدود، لاکھوں پیچ پڑتے ہیں
عقیدے، عقل، فطرت سب کے سب آپس میں لڑتے ہیں"

تو واقعہ یہ ہے کہ دولتِ خداداد پاکستان کے صوبۂ سندھ کی سرزمین اس وقت قسم قسم کے تصادم، رنگارنگ شکایتوں اور طرح طرح کی محرومیوں کے احساس کی بناء پر اس شعر کے مصرعِ ثانی کی منہ بولتی تصویر بن گئی ہے ـــ اس لئے کہ اوّل تو نسلوں اور زبانوں اور ثقافتوں پر مبنی "قومیتوں" کی جتنی بڑی کھچڑی سندھ میں تیار ہوئی ہے ایسا معجونِ مرکّب کم از کم پاکستان کے کسی اور حصّے میں موجود نہیں ہے ـــ پھر کراچی میں صنعت و تجارت کے ارتقاء اور ارتکاز اور انتہائی برق رفتاری سے بڑھنے والی آبادی نے جن پیچیدہ مسائل کو جنم دیا ہے ان کی شدّت کی بھی کوئی دوسری مثال پاکستان کے کسی دوسرے مقام یا علاقے میں نظر نہیں آتی ـــ بنا بریں اس وقت سندھ کا کوئی ایک سادہ مسئلہ نہیں ہے بلکہ بے شمار مسائل کا ایک طویل اور پیچیدہ سلسلہ ہے، اور یہاں کسی ایک ہی طبقے میں احساسِ محرومی نہیں پایا جاتا بلکہ مختلف گروہوں اور طبقوں میں مختلف قسم کی محرومیوں کا احساس موجود ہے، اور اُن کی بناء پر پیدا ہونے والے گلے شکوے بلکہ ان سے بھی بڑھ کر نفرتیں اور عداوتیں باہم اتنی گڈمڈ ہو گئی ہیں کہ بسا اوقات انسان کو خود بھی معلوم نہیں ہوتا کہ کسی خاص موقع پر وہ کونسے احساسِ محرومی کے باعث ردّ عمل کا شکار ہو رہا ہے اور

اس کی نفرت وعداوت اور غیظ و غضب کا اصل سبب کیا ہے اور ان کا اظہار وہ کس کے خلاف کر رہا ہے۔ چنانچہ اسی مرکب اور پیچ در پیچ احساسِ محرومی کے باعث سندھ میں وقتاً فوقتاً آتش فشاں کے پھٹنے کی سی صورت پیدا ہو جاتی ہے اور اس کے دوران اچھے بھلے انسان ہسٹیریا کی سی کیفیت میں مبتلا نظر آتے ہیں!

دوسری طرف، جیسے کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے، سندھ اس وقت نہ صرف پاکستان بلکہ اس پورے علاقے میں خود اسلام کے مستقبل کے ضمن میں جسم کے نازک حصّے (SOFT UNDER-BELLY) کی حیثیت اختیار کر چکا ہے ___ لہٰذا اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ اس کے مسائل کا حقیقت پسندانہ تجزیہ کیا جائے اور امکانی حد تک معروضی اور غیر جانبدارانہ انداز میں جائزہ لیا جائے کہ سندھ کے مختلف طبقات کو کیا کیا شکایتیں ہیں، اور کون کون سے اندیشے لاحق ہیں، مزید یہ کہ اُن کا کتنا حصّہ حقیقی اور واقعی ہے، کتنا اضافہ انسان کی اس طبعی کمزوری کا مظہر ہے کہ ؏ "بڑھا بھی دیتے ہیں کچھ زیبِ داستاں کے لئے!" اور کتنا ملک وملّت کے دشمنوں کی دسیسہ کاری اور "ایجادِ بندہ" کا نتیجہ ہے جس کی نہ کوئی اصل ہے نہ اساس! ___ پھر غور کرنا چاہئے کہ حقیقی اور واقعی شکایات کے مستقل ازالے کی صورت کیا ہے اور فوری طور پر ان کی شدّت میں کمی پیدا کرنے کے لئے کیا تدابیر اختیار کی جا سکتی ہیں۔

اس طرح کیا عجب کہ سندھ کے مسائل کا یہ تجزیاتی مطالعہ پورے پاکستان کے مسائل کی پہچان کا ذریعہ بن جائے اور بر ؏ "روحِ مسلماں میں ہے آج وہی اضطراب" کے مصداق اس وقت سندھ جس بحرانی کیفیت سے دوچار ہے اور جس اضطراب اور کرب میں مبتلا ہے کیا عجب کہ وہ کسی نئے عہدِ سعادت کی ولادت کے درد کی لہریں (BIRTH PANGS) ثابت ہوں اور اللہ تعالیٰ شر سے خیر برآمد فرما دے، اس لئے کہ اس کی شان یہ ہے کہ:

"يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ	"وہ نکال لاتا ہے مُردہ سے زندہ کو اور زندہ
الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَيُحْيِي الْأَرْضَ	سے مُردہ کو اور زندہ کر دیتا ہے زمین کو اس
بَعْدَ مَوْتِهَا" (سورۂ روم: آیت ۱۹)	کے مُردہ ہو جانے کے بعد"

لہٰذا اس کی قدرت سے کچھ بعید نہیں ہے اگرچہ بقول علّامہ اقبال ؏ "رازِ خدائی ہے یہ کہہ نہیں سکتی زباں!"

اس تجزیئے میں چونکہ مختلف طبقات کی غلطیوں اور کوتاہیوں کا ذکر بھی لامحالہ آئے گا، لہٰذا اندیشہ ہے کہ بمصداق "اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش!" کے مصداق راقم کے خلاف سب ہی کی جانب سے برہمی اور خفگی کا اظہار ہو، اس لئے کہ فی زمانہ ہر شخص اور ہر گروہ سارا الزام دوسروں ہی پر ڈال دینے کا عادی ہو چکا ہے اور کوئی بھی خود اپنے دامن کے داغ اور دھبے دیکھنے پر آمادہ نہیں ہوتا ـــــ چنانچہ حال ہی میں راقم کو اس کا ایک تلخ تجربہ ہو بھی چکا ہے کہ خود احتسابی (SELF CRITICISM) کی ایک ذرا سی دعوت پر ایک گروہ اس درجہ ناراض ہوا کہ، اخبارات میں شائع ہونے والے مضامین سے قطع نظر کہ اُن میں تو ظاہر ہے کہ تہذیب وشائستگی کا دامن ہاتھ سے بالکلیہ چھوڑ دینا ممکن نہیں ہوتا، نجی خطوط میں غلیظ گالیوں تک کی نوبت آ گئی ـــــ لیکن راقم الحروف کے پیشِ نظر الحمد للہ حسبِ ذیل قرآنی ہدایات ہیں:

"وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى" (سورۂ انعام: آیت ۱۵۲)	ترجمہ "اور جب بھی بات کرو انصاف ہی کی کرو خواہ کوئی تمہارا رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو!"
"كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ" (سورۂ نساء: آیت ۱۳۵)	ترجمہ "عدل وانصاف کے علمبردار اور اللہ کے گواہ بن کر کھڑے ہو جاؤ خواہ وہ خود تمہارے اپنے یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں ہی کے خلاف ہو!"
"كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى" (سورۂ مائدہ: آیت ۸)	ترجمہ "اللہ کے علمبردار اور عدل وانصاف کے گواہ بن کر کھڑے ہو جاؤ اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں ناانصافی پر آمادہ نہ کرے۔ (ہر حال میں) انصاف کرو، یہی تقویٰ کے شایانِ شان ہے!"

لہٰذا اس تجزیئے میں راقم الحروف اپنے امکان بھر تو حق وانصاف ہی کی بات کرنے کی کوشش کرے گا ـــــ تاہم وہ اس کا ہرگز مدعی نہیں ہے کہ اس کی ہر رائے حرفِ آخر ہے اس لئے کہ ہو سکتا ہے کہ کسی خاص معاملے میں اس کے مشاہدات محدود اور معلومات ناقص ہوں۔ یا نتیجہ اخذ کرنے

میں غلطی ہو جائے۔ لہٰذا کسی بھی جانب سے ایسی کسی بھی نشاندہی پر راقم ان شاء اللہ العزیز ممنون و مشکور بھی ہوگا اور اُس پر کھلے دل و دماغ کے ساتھ غور کرنے کی کوشش بھی کرے گا۔ اس لئے کہ راقم کے نزدیک ملک و ملّت کی خیر خواہی اسی میں ہے کہ قومی و ملّی مسائل پر سنجیدگی کے ساتھ غور بھی کیا جائے اور اپنی آراء کا بلا جھجک اظہار بھی کیا جائے اور پھر دوسروں کی آراء پر بھی کھلے دل کے ساتھ غور کیا جائے۔ اللہ تعالےٰ ہم سب کو حق کہنے، حق سننے، حق کو پہچاننے اور حق کو قبول کرنے کی توفیق عطا فرمائے: اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّ ارْزُقْنَا اتِّبَاعَہٗ وَ اَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّ ارْزُقْنَا اجْتِنَابَہٗ۔ اٰمین!

قدیم سندھی مسلمانوں کی عمومی بے چینی کے عناصر ثلاثہ

ذرا بنظرِ غائر دیکھا جائے تو صاف نظر آجائے گا کہ سندھ کے دوسرے طبقوں اور گروہوں، جیسے اردو بولنے والے مہاجروں، پنجابی آباد کاروں اور پٹھان محنت کاروں کے گوناگوں مسائل سے قطعِ نظر، خود قدیم سندھیوں کا احساسِ محرومی بھی کوئی سادہ اور بسیط شے نہیں ہے بلکہ بہت سی مختلف النوع محرومیوں اور بے چینیوں کا معجونِ مرکب ہے جو کئی تہوں اور متعدد سطحوں پر مشتمل ہے ۔۔۔۔ چنانچہ اس کی سب سے زیریں سطح پر تو وہ بے چینی اور اضطراب پایا جاتا ہے جس کے اسباب کسی ایک صوبے یا علاقے تک محدود نہیں ہیں بلکہ ملک گیر ہیں، اگرچہ ان کے نتائج اور اثرات کو بعض ثانوی اسباب کی بنا پر محسوس سب سے بڑھ کر سندھ میں کیا گیا ہے۔ پھر اس کے اوپر کئی اضافی سطحیں ہیں جن کا تعلق سندھ کے خاص حالات سے ہے اور جنہوں نے صورتِ حال کو بے حد پیچیدہ اور سنگین بنا دیا ہے۔

ا۔ ملک گیر سیاسی محرومی اور معاشی استحصال

سندھ کی عمومی بے چینی اور عوامی اضطراب کا سب سے گہرا اور بنیادی سبب وہ ظالمانہ اور استحصالی سیاسی و معاشی نظام ہے جو پورے ملک پر مسلط ہے اور جس کے نتیجے میں پوری پاکستانی قوم شدید قسم کی اُفقی تقسیم اور محاذ آرائی (HORIZONTAL POLARISATION) کا شکار ہو گئی ہے۔ چنانچہ ظالم و مظلوم، قاہر و مقہور اور جابر و مجبور کی تقسیم بھی نمایاں نظر آتی ہے اور

'مستکبرین' (ARISTOCRATES) اور 'مستضعفین' (OPRESSED) کے علاوہ 'مستحصلین' (EXPLOITERS) اور 'مستحصَلین' (EXPLOITED) کے مستقل طبقات بھی وجود میں آچکے ہیں۔ چنانچہ اس کا ردِّ عمل بھی کم و بیش تو پورے ملک اور اس کے چاروں صوبوں میں موجود ہے۔ لیکن بوجوہ اس کی شدّت اور تلخی سب سے زیادہ صوبہ سندھ میں محسوس کی جا رہی ہے۔

اس کا تاریخی پس منظر یہ ہے کہ اوّلاً ـــــ خود سلطنتِ مغلیہ کی اساس ازمنۂ وسطیٰ کے اس ظالمانہ جاگیرداری نظام پر قائم تھی جو پوری دنیا میں صدیوں سے رائج چلا آرہا تھا۔ پھر جب وہ کمزور پڑ گئی اور برِّ عظیم پاک و ہند کے طول و عرض میں طوائف الملوکی کا دور دورہ ہوا تو "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" کا قدیم قانون مزید گھناؤنی صورت میں نافذ ہو گیا اور ہر جگہ جتھے دار اور قبائلی سرداروں نے اپنی اپنی حکومتیں قائم کر لیں ـــــ اس کے بعد انگریز کا دور آیا تو اس نے کمالِ حکمتِ عملی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسی نظام کو اپنے جبر و استحصال کا ذریعہ اور آلہ بنا لیا۔ اور اپنے اور مقامی جاگیرداروں اور وڈیروں کے مابین رابطے کے لئے ایک مضبوط اور مستحکم سول سروس قائم کی جو اکثر و بیشتر ایسے لوگوں پر مشتمل تھی جو رنگ اور شکل و صورت کے اعتبار سے تو ہندوستانی تھے لیکن ذہن و فکر اور تہذیب و تمدن کے اعتبار سے خالص انگریز بن گئے تھے

بعد ازاں جب ملک آزاد ہوا تو بھارت میں تو حکومت ایک ایسی سیاسی جماعت کے ہاتھ میں آئی جس کے پاس مخلص کارکنوں کی بھی ایک بڑی تعداد موجود تھی اور ایسے لیڈروں کی بھی کمی نہ تھی جو ایک طویل عوامی جدوجہد کے دوران ایثار اور قربانی کی شاندار مثالیں اور اپنے خلوص و اخلاص کے بے شمار ثبوت پیش کر چکے تھے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کی تنظیم کا ڈھانچہ دیہات اور قصبات سے لے کر کُل ہند سطح تک قائم تھا۔ اور اس کے کارکنوں کی صفیں بھی مرتّب و منظّم تھیں اور عہدوں اور منصبوں کا نظام بھی معیّن و مستحکم تھا ـــــ مزید برآں اس جماعت نے حکومت ہاتھ میں لیتے ہی دیسی ریاستوں کا بھی خاتمہ کر دیا اور سابق برٹش انڈیا میں قائم جاگیرداری اور زمینداری نظام کو بھی ختم کر دیا ـــــ نتیجۃً وہاں کم از کم سیاسی آزادی براہِ راست عوام تک پہنچ گئی اور حکومت بنانے یا بدلنے کا اختیار بالکلیہ

اُن ہی کے ہاتھوں میں آگیا۔

اس کے برعکس ــــــ پاکستان بھی اگرچہ قائم تو عوامی جدّوجہد اور عوامی رائے (VOTE) کے نتیجے میں ہوا تھا لیکن چونکہ مسلم لیگ کی حیثیت اصلاً ایک تحریک (MOVEMENT) کی تھی نہ کہ جماعت (PARTY) کی، اور جیسا کہ تحریکوں کا خاصہ ہے، اس کی کُل جدّوجہد ایک شخص یعنی قائدِ اعظم محمد علی جناح کی 'معجزانہ' اور کرشماتی شخصیت (دیکھئے 'استحکامِ پاکستان' کا بابِ ہفتم) کی مرہونِ منّت تھی اور بدقسمتی سے اُن کا انتقال قیامِ پاکستان کے تقریباً فوراً ہی بعد ہوگیا ــــــ لہٰذا یہاں آزادی کے ثمرات اور حکومت کے اختیارات کسی مضبوط اور مستحکم سیاسی جماعت کی وساطت سے عوام تک پہنچے ہی نہیں پائے بلکہ انہیں نوابوں اور جاگیرداروں امیروں اور پیروں، اور زمینداروں اور وڈیروں نے بیچ ہی میں اُچک لیا ــــــ لیکن پھر چونکہ خود ان کے مابین نہ کسی سیاسی نظریّے اور فلسفے کا رشتہ موجود تھا، نہ باہمی معاملے کے کوئی اصول طے تھے، نہ افہام و تفہیم کے کوئی خطوط ہی معیّن تھے، لہٰذا ان کی باہمی بندر بانٹ اور چھینا جھپٹی سے وہ افراتفری پیدا ہوئی کہ الامان والحفیظ!! ــــــ اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھا کر سول سروس نے خوب پَر پُرزے نکالے اور بیوروکریسی نے اپنے اختیارات کا بھرپور استعمال کرتے ہوئے حکومت کی باگ ڈور خود سنبھال لی ــــــ اور اس کے بھی کچھ ہی دن بعد "قوّت ہی برحق ہے" (MIGHT IS RIGHT) کا اصول مزید عریاں انداز میں سامنے آیا اور زمامِ اقتدار قوم کے سب سے طاقت ور اور منظّم ادارے یعنی فوج نے سنبھال لی۔ گویا ؎

"وفا کیسی کہاں کا عشق جب سَر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو!"

یعنی جب حکومت کا اختیار اس کے اصل حقداروں یعنی عوام سے چھیننا ہی ٹھہرا تو پھر یہ سول سروس کے نرم و نازک ہاتھوں میں کیوں رہے؟ اور کیوں نہ فوج کے تندرست و توانا ہاتھ اس کے مالک بن جائیں؟؟

وہ دن اور آج کا دن، پاکستان میں اصل قوّت و اقتدار تو فوج کے ہاتھ میں ہے اور اس کے مستقل نائب و مددگار اور وزیرو مشیر کی حیثیت سول سروس کو حاصل ہے۔ البتہ گاہے گاہے فوجی حکمران وقتی مصالح

کے تحت اور بالخصوص عوام کے تیور بدلتے دیکھ کر عارضی طور پر زمینداروں
اور وڈیروں کو بھی اقتدار و اختیار میں کسی قدر حصہ دار بنا لیتے ہیں اور اس
طرح 'بحالیٔ جمہوریت' کا ڈھونگ رچاتے رہتے ہیں ـــــ !!!

چنانچہ مختلف ادوار میں حکومت کی ظاہری شکل و صورت بھی کسی قدر بدلتی رہتی ہے اور اس کے متذکرہ بالا اجزائے ترکیبی کی باہمی نسبت و تناسب میں بھی کچھ فرق واقع ہوتا رہتا ہے ــــ لیکن بہرصورت اصل 'دولتِ اقتدار' بالکل "دُوْلَۃً بَیْنَ الْاَغْنِیَاءِ مِنْکُمْ" کی سی شان کے ساتھ ان تین طبقوں ہی کے مابین گردش کرتی رہتی ہے۔ (سورۂ حشر: آیت ۷: "تاکہ نہ رہے وہ گردش میں تمہارے اُمراء ہی کے مابین!") اور ظاہر ہے کہ یہ صورتِ حال کم از کم بیسویں صدی عیسوی کے اواخر میں ہرگز قابلِ قبول نہیں ہو سکتی جبکہ عرصہ ہوا کہ علامہ اقبال کے بقول ابلیسِ لعین نے بھی عوامی بیداری کے پیشِ نظر ملوکیتِ مطلقہ کو عوامی جمہوریت کا لباس پہنا دیا ہے ؎

"ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس — جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر!"

چنانچہ پوری پاکستانی قوم کے تحت الشعور میں ایک بے چینی اور احساسِ محرومی سرایت کئے ہوئے ہے اگرچہ بعض اسباب کی بنا پر، جن کا ذکر ابھی ہوگا، اس کا احساس و شعور سب سے بڑھ کر سندھ کے قدیم باسیوں کو ہوا!

فوج، سول سروس اور 'خداوندانِ زمین'[1] (LAND LORDS) کے ساتھ ساتھ 'سرمایہ داروں' کا ایک چوتھا طبقہ بھی پاکستان میں نہایت تیزی کے ساتھ پروان چڑھا جس نے سیاسی جبر و استبداد پر معاشی استحصال کا 'بالاخانہ' تعمیر کیا اور اس طرح متذکرہ بالا افقی تقسیم اور محاذ آرائی کو مزید گہرا اور نمایاں کر دیا ــــ اس طبقے کے بارے میں یہ اہم حقیقت لائقِ توجہ ہے کہ چند قدیم کاروباری خاندانوں اور تجارت پیشہ برادریوں کے سوا (جیسے گجرات کے میمن، بمبئی کے خوجے اور بوہرے، دہلی اور یوپی کی 'پنجابی سوداگر برادری' اور پنجاب کی قدیم شیخ برادریاں) پاکستان کے 'نو دولتیے' طبقے کی عظیم اکثریت اسی 'اتحادِ ثلاثہ' کی کوکھ سے برآمد بھی ہوئی ہے اور اسی کی جائز و ناجائز سرپرستی سے پروان بھی چڑھی ہے ــــ چنانچہ ایک

---

[1] ؎ "وہ خدایا یہ زمیں تیری نہیں تیری نہیں — تیرے آبا کی نہیں، تیری نہیں، میری نہیں!" اقبال

طرف پاکستان کے اکثر و بیشتر بڑے زمین دار اب بڑے کارخانہ دار بھی بن گئے ہیں اور دوسری طرف فوجی جرنیلوں کی اکثریت بھی نہ صرف یہ کہ فرداً فرداً بھی زمیندار اور کارخانہ دار بن گئی ہے، حالانکہ ان کی غالب اکثریت نے انگریزی فوج کے حوالداروں اور صوبیداروں یا ادنیٰ اور متوسط طبقے کے سول ملازمین کے گھروں میں آنکھ کھولی تھی، بلکہ 'فوجی فاؤنڈیشن' کو اب غالباً ملک کے سب سے بڑے صنعتی ادارے کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے —— رہی سول سروس تو وہ بھی اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے میں کسی سے پیچھے نہیں رہی، اگرچہ اس کی اکثریت نے صرف جائدادوں اور سرکاری تمسکات اور صنعتی حصص کی صورت میں 'سرمایہ کاری' ہی پر قناعت اور اکتفا کی ہے!

الغرض، یہ ہے اُس سیاسی و معاشی ناانصافی اور عمومی ظلم و استحصال اور اس سے پیدا شدہ احساسِ محرومی کا پس منظر، جو اگرچہ فی نفسہٖ تو ملک گیر ہے لیکن اس کا ردِّعمل پاکستان کے مختلف علاقوں میں کم و بیش شدّت کے ساتھ ظاہر ہوا ہے —— تو آئیے کہ اب ایک نظر عمومی ظلم و استحصال کے خلاف ردِّعمل کی شدّت کی اس کمی اور بیشی کے اسباب پر ڈال لیں۔

اس ملک گیر سیاسی ظلم اور معاشی استحصال کے شعور و احساس اور ان کے خلاف ردِّعمل کے ظہور کے ضمن میں ایک فرق تو یہ ہے کہ اس کی شدّت پاکستان کے شمالی صوبوں یعنی پنجاب اور سرحد کے مقابلے میں جنوبی صوبوں یعنی سندھ اور بلوچستان میں نمایاں طور پر زیادہ نظر آتی ہے —— اور دوسرا فرق یہ ہے کہ جنوبی صوبوں میں سے بلوچستان میں اس کا ظہور مختلف انداز سے ہوا اور سندھ میں مختلف صورت میں!

ان میں سے متقدم الذکر فرق و تفاوت کی ایک وجہ قدیم تاریخ سے متعلق ہے اور اس کا ایک دوسرا سبب ماضی قریب کی تاریخ کے ایک اہم واقعہ سے تعلق رکھتا ہے۔

ہندوستان کی تاریخ سے ادنیٰ واقفیت رکھنے والا شخص بھی جانتا ہے کہ پنجاب اور سرحد اور بالخصوص ان کے وسطی علاقے قدیم زمانے سے حملہ آوروں اور فاتحوں کی گذرگاہ رہے ہیں —— چنانچہ اس علاقے میں کوئی اہم اور قابلِ ذکر مقامی حکومت کبھی زیادہ دیر قائم نہیں رہ

سکی، یہی وجہ ہے کہ تین صدی قبل کے راجہ پورس کے بعد پھر انیسویں صدی عیسوی کے مہاراجہ رنجیت سنگھ ہی کا نام ملتا ہے! علاوہ ازیں، اس علاقے میں کوئی مضبوط مقامی نیشنلزم بھی جڑیں نہیں پکڑ سکا بلکہ اس کے برعکس یہاں کے لوگوں میں "گلشن پرست ہوں مجھے گل ہی نہیں عزیز۔ کانٹوں سے بھی نباہ کئے جا رہا ہوں میں" کے مصداق نت نئے فاتحین کے ساتھ معاملہ کرنے اور بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ سازگاری اختیار کرنے کی صلاحیت بدرجۂ اتم پیدا ہو گئی۔ چنانچہ سکھوں کے عروج و زوال کی تاریخ کے یہ دو نکتے بہت قابلِ توجہ ہیں کہ ایک طرف مہاراجہ رنجیت سنگھ کے سیاسی عروج کا آغاز ہی ابدالی کی توپوں کو دریا پار کرا دینے کی خدمت کے معاوضے کا مرہونِ منت ہے ___ اور دوسری طرف اس کے باوجود کہ انگریزوں نے حکومت سکھوں سے چھینی تھی، سکھوں کو فوراً ہی انگریز کے ساتھ سازگاری اختیار کرنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی ___ حتیٰ کہ انہوں نے انگریز کی فوج میں بھرتی ہو کر "کارہائے نمایاں" سرانجام دینے میں بھی کوئی جھجک محسوس نہیں کی!

اس کے برعکس سندھ اور بلوچستان تاریخ کے دوران زیادہ تر الگ تھلگ رہے اور وہاں بیرونی فاتحین کا عمل دخل بہت کم رہا۔ نتیجتہً وہاں مقامی نیشنلزم کی جڑیں بھی خوب گہری ہوئیں اور تہذیبی و ثقافتی روایات بھی پختگی کے ساتھ قائم ہوئیں ___ مزید برآں وہاں کے لوگ مقامی سرداروں اور حکمرانوں کی تو بدترین غلامی کو بھی برداشت کرنے کے عادی بنے اس لئے کہ یہ مقامی سردار اور حکمران سے "خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر۔ پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری" کے مصداق اپنے مقاصد اور مفادات کے لئے مقامی نیشنلزم کو بھی استعمال کرتے رہے ___ لیکن یہ واقعہ ہے کہ سندھیوں اور بلوچیوں میں بیرونی فاتحین اور بدیسی حکمرانوں کے ساتھ سازگاری کی صلاحیت پیدا نہیں ہو سکی بلکہ ان کے دلوں میں ایسی حکومتوں کے خلاف ہمیشہ نفرت اور بغاوت کے جذبات موجود رہے!

اس طویل تاریخی پس منظر پر مستزاد ماضیٔ قریب کی تاریخ کا وہ اہم واقعہ جس نے پاکستان کے شمالی اور جنوبی حصّوں کے لوگوں، خصوصاً پنجابیوں اور سندھیوں کے مابین موجودہ ذہنی و نفسیاتی بُعد پیدا کرنے میں سب سے مؤثر حصہ ادا کیا ہے، یہ ہے کہ اگرچہ اس پورے

علاقے میں انگریزی راج تقریباً ایک ہی وقت شروع ہوا یعنی انیسویں صدی کے وسط کے لگ بھگ ـــ لیکن اس وقت تک سندھ اور بلوچستان دونوں آزاد تھے ـــ چنانچہ سندھ میں تالپوروں کی باضابطہ حکومت قائم تھی اور بلوچستان میں خان آف قلات کی سربراہی میں قبائلی نظام قائم تھا، گویا انگریز نے حکومت براہِ راست مسلمانوں سے چھینی، لہٰذا سندھیوں اور بلوچیوں میں انگریز کی جبری غلامی کے باوجود انگریزوں سے نفرت وعداوت ہی نہیں باضابطہ بغاوت کے جذبات مسلسل موجود رہے ـــ جبکہ انگریز کی آمد سے قبل پنجاب پر سکھا شاھی، مسلّط تھی جو محض غلامی ہی نہیں ظلم وستم اور قہر وعذاب کی بدترین صورت تھی ـــ لہٰذا یہاں انگریز گویا مسلمانوں کا محسن اور نجات دہندہ بن کر آیا اور اس نے پنجابی مسلمانوں کو توہین وتذلیل، لوٹ مار، اور بدترین جبر واستبداد کے پنجے سے چھڑا کر ایک قانونی اور رفاہی حکومت کا تحفہ دیا ـــ نتیجۃً یہاں کے مسلمانوں میں انگریز دشمنی کی بجائے "ھَلْ جَزَاءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ" کے عین مطابق انگریزوں کی خیر خواہی اور وفاداری کے جذبات پیدا ہوئے ۔ اگرچہ انگریزوں نے اپنی روایتی چال بازی اور عیّاری سے کام لیتے ہوئے اس کا بہت ناجائز فائدہ اٹھایا ۔ چنانچہ اوّلاً پنجابی مسلمانوں کی مدد سے ہندوستان میں اپنے استعمار کو مستحکم کیا اور ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے دوران دارالسلطنت دہلی جو ان کے ہاتھ سے نکل چکا تھا اُن ہی کی مدد سے دوبارہ فتح کیا ـــ اور پھر بیسویں صدی کے آغاز میں پہلی جنگِ عظیم کے دوران پنجابی مسلمانوں کا سستا خون خلافتِ عثمانیہ کے خاتمے کے لیے استعمال کیا ـــ واضح رہے کہ سکھوں کی براہِ راست عملداری میں پنجاب کے ساتھ ساتھ صوبہ سرحد کے بعض علاقے تو مستقلاً شامل تھے اور باقی اکثر حصّے کی حیثیت بھی ان کے باج گذار کی سی تھی، یہی وجہ ہے کہ انگریزوں کے ضمن میں متذکرہ بالا نفسیاتی کیفیت پنجاب کے ساتھ ساتھ سرحد کے بھی بہت سے علاقوں کے لوگوں میں پیدا ہوئی اور انگریزی فوج میں پنجابی مسلمانوں کے شانہ بشانہ سرحد کے بعض علاقوں بالخصوص مردان، پشاور اور کوہاٹ کے اضلاع کے لوگ بھی شریک ہوئے!

ان دو اہم وجوہات کی بنا پر پاکستان میں قائم ہونے والے جابرانہ اور استحصالی نظام کے

خلاف، جسے ' دیسی نوآبادیاتی نظام ' سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، پنجاب اور سرحد کے لوگوں میں تو کوئی خاص ردِ عمل پیدا نہیں ہوا لیکن سندھ اور بلوچستان میں شدید ردِ عمل رونما ہوا خصوصاً اس لئے کہ، جیسے کہ ابھی وضاحت کی جائے گی، اس ' دیسی امپیریلزم ' میں پنجاب کی بالادستی کا عنصر بھی شامل ہو گیا جو سندھ اور بلوچستان کے مقامی نیشنلزم کی نگاہ میں بہرحال ' بدیسی ' تھا —

سندھ اور بلوچستان میں اس ردِ عمل کے ظہور کی مختلف صورتوں کا سبب یہ ہے کہ چونکہ بلوچستان میں ازمنۂ قدیم کا قبائلی نظام پوری گہرائی اور گیرائی کے ساتھ قائم تھا، چنانچہ وہاں یا تو مالکِ مطلق اور مختارِ کل قبائلی سردار تھے یا ایسے جاہل و غافل عوام جو ہر اعتبار سے "کالانعام" تھے اور کوئی درمیانی طبقہ سرے سے موجود ہی نہیں تھا لہٰذا وہاں ردِ عمل وقتاً فوقتاً قبائلی شورش اور بغاوت کی صورت میں تو ظاہر ہوا لیکن اس نے کسی مستقل عوامی تحریک کی صورت اختیار نہیں کی ___ جبکہ سندھ میں اس کے برعکس ایک مضبوط مڈل کلاس بھی موجود تھی اور تعلیمیافتہ طبقہ بھی، لہٰذا وہاں اس ردِ عمل نے ایک مسلسل سلگنے والی آگ کی صورت اختیار کر لی جو اگرچہ فوری طور پر تو ظاہر نہیں ہوتی لیکن اندر ہی اندر بڑھتی اور پھیلتی چلی جاتی ہے!

افسوس کہ اس صورتِ حال کی جانب نہ پاکستان کے بہی خواہوں نے توجہ دی نہ اسلام کے علمبرداروں نے۔ بلکہ پاکستان اور پاکستانی قومیت کے نام لیوا سیاسی زعماء تو اختیارات اور مفادات کی بندر بانٹ اور چھینا جھپٹی ہی میں مصروف رہے ___ رہے دین کے علمبردار تو ان میں سے قدیم مزاج کے بزرگوں کی اکثریت تو ماحول سے بالکل لاتعلق رہتے ہوئے صرف قال اللہ اور قال الرسولؐ میں منہمک رہی، ایک عظیم مذہبی تحریک صرف عبادات اور اتباعِ سنّت کی تلقین کرتی رہی، بعض فرقہ پرست لوگ اسلام کے نام کو اپنی سیاسی مہم جوئی کے لئے استعمال کرتے رہے اور بعض بظاہر وسیع النظر اور جدید مسائل سے واقفیت رکھنے والے لوگ بھی عمرانیات کے مختلف گوشوں بالخصوص اقتصادیات اور معاشیات کے ضمن میں اسلام کی ان تعبیرات سے آگے نہ بڑھ سکے جو دورِ ملوکیت میں مرتب ہوئی تھیں ___ مزید برآں، انہوں نے ' اقامتِ دین ' ایسے بلند و بالا نصب العین کے لئے انقلابی کے بجائے سیاسی طریقِ کار اور انتخابی سیاست کا راستہ اختیار کر کے اپنے آپ کو کم از کم ظاہری طور پر ان لوگوں سے

کے "مشابہ" بنا لیا جو سیاسی میدان میں اسلام کا نعرہ محض اپنی مطلب برآری کے لئے لگاتے ہیں ۔۔۔ بہرحال ان سب باتوں کا مجموعی نتیجہ یہ نکلا کر سندھ اور بلوچستان کے "غیر مطمئن" اور علامہ اقبال کے الفاظ میں "حاضر و موجود سے بیزار" عناصر کو ظلم و استحصال کے اسباب کی توجیہہ و تشخیص مارکس کے نظریات میں' اور اس کا مداوا اور ازالہ' اور عدل و انصاف کے قیام کی واحد صورت اشتراکی نظام میں نظر آئی ۔۔۔ اور سندھ اور بلوچستان کی نوجوان تعلیم یافتہ نسل کا فیصلہ کن رجحان مارکس ازم اور کمیونزم کی جانب ہوتا چلا گیا۔ چنانچہ بلوچستان میں اُس کا ظہور "بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن" (B.S.O.) کی صورت میں ہوا ۔۔۔ اور سندھ میں اس نے اچانک "سندھ عوامی تحریک" (S.A.T.) کی صورت میں منظرِ عام پر آ کر عوام ہی نہیں' سیاسی مبصرین اور تجزیہ نگاروں تک کو حیران و ششدر کر دیا۔

الغرض یہ ہے سندھ کی عمومی بے چینی اور احساسِ محرومی کی سب سے زیریں اور تحتانی سطح جو بعض ثانوی عوامل کے زیادہ نمایاں ہونے کے باعث نظر کم آتی ہے۔ لیکن ہے سب سے بڑھ کر اہم اور سب سے زیادہ طاقت ور ۔۔۔ اور اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ اس کا علاج نہ مارشل لاء میں ہے' نہ طاقت کے استعمال میں' اس لئے کہ ایسے معاملات میں طاقت کا استعمال ع "بڑھتا ہے ذوقِ جرم یہاں ہر سزا کے بعد!" کے مصداق اُلٹے نتائج پیدا کرتا ہے! ۔۔۔ اسی طرح اس کا مداوا نہ کفر کے فتوے جاری کرنے سے ہو سکتا ہے' نہ پاکستانی قومیت کی دہائی دینے سے اور نہ ہی مذہبی اور قومی تقریبات پر پانی کی طرح پیسہ بہانے سے ۔۔۔ بلکہ اس کا واحد حل یہ ہے کہ اسلام کے نظامِ عدل و قسط کو بالفعل قائم کیا جائے جس کے نتیجے میں نہ سماجی سطح پر کوئی امتیاز (DISCRIMINATION) باقی رہے' نہ سیاسی سطح پر جبر و استبداد (EPRESSION)، اور نہ معاشی سطح پر ظلم و استحصال (EXPLOITATION)! بلکہ معاشرتی سطح پر گہری اسلامی اخوت اور کامل سماجی مساوات کا دور دورہ ہو اور سیاسی سطح پر اسلامی حریت اور دستوری و قانونی برابری کا نظام قائم ہو۔ بقول اقبال:

؎ کُلُّ مُؤمِنٍ اِخْوَۃٌ اندر دِلش حریت سرمایۂ آب و گِلش
ناشکیبِ امتیازات آمدہ !! در نہادِ او مساوات آمدہ!!

اور اس کے ساتھ ساتھ معاشی میدان میں ملکیت کی بجائے امانت کا تصور محسوس و مشہود ہو اور کفالت عامّہ کا اصول اور حصولِ رزق کے ذرائع اور ترقی کے مواقع کے ضمن میں کامل برابری بالفعل موجود ہو، بقول سعدیؒ

؎ ایں امانت چند روزہ نزدِ ماست　　　　در حقیقت مالکِ ہر شے خداست

اور بقول اقبالؒ

؎ رزقِ خود را از زمیں بُردن رَواست　　　　ایں متاعِ بندہ و مِلکِ خداست

اور ؎ کس نہ باشد در جہاں محتاجِ کس　　　　نکتۂ شرعِ مبیں ایں است و بس!

اور چونکہ یہ جملہ مقاصد ایک ہمہ گیر اور کُلّی اسلامی انقلاب کے بغیر حاصل نہیں کئے جا سکتے لہٰذا نہ صرف صوبۂ سندھ بلکہ پورے پاکستان کے اصل اور بنیادی مسئلے کا واحد حل ـــــ اسلامی انقلاب ہے جو پیشِ نظر کتاب کا اصل موضوع ہے!

۲۔ پنجاب سے شدید نفرت

سندھ کے پیچ دَر پیچ مسئلے کا دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ قدیم سندھی آبادی اور خاص طور پر اُس کی نوجوان نسل میں پنجاب اور اہلِ پنجاب سے شدید نفرت کے جذبات پیدا ہو چکے ہیں، اور نفرت چونکہ نفرت ہی کو جنم دے سکتی ہے لہٰذا رفتہ رفتہ صورت باہمی بغض و عداوت کی بن رہی ہے اور اس صورتِ حال میں بلاشبہ پاکستان کی سالمیت کے لئے سب سے اہم خطرہ مضمر ہے!

اس سلسلے میں بجائے اس کے کہ لیپا پوتی سے کام لیا جائے اور اس روایتی کبوتر کا طرزِ عمل اختیار کیا جائے جو بلّی کو دیکھ کر آنکھ بند کر لیتا ہے ضرورت اس امر کی ہے کہ حقائق کو تسلیم کیا جائے اور ان کے اسباب و محرّکات کا سراغ لگایا جائے تاکہ ایک دوسرے کی صحیح پوزیشن کے فہم و ادراک سے ایک دوسرے کے لئے حقارت کی بجائے، ہمدردی کے جذبات پیدا ہوں۔

اس وقت واقعہ یہ ہے کہ ایک عام سندھی نوجوان پنجابیوں کو 'دیسی سامراج' کی

علامت اور اس "نئے نوآبادیاتی نظام" کے ذریعے ظلم و استحصال کا "مجرم" گردانتا ہے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ اور جیسے کہ عرض کیا جا چکا ہے، اس احساس کی پیدائش کا اولین سبب تو پاکستان کی اس مرکزی سول سروس کی بدعنوانیاں تھیں جس میں پنجابیوں کا تناسب "حصہ بقدرِ جُثہ" کے اصول کے مطابق سب سے بڑھ کر تھا۔ پھر اس جلتی آگ پر تیل کا کام کیا مارشل لاء کے تسلسل اور طوالت نے ___ اور اس پر مزید اضافہ ہوا کچھ ان پنجابی آبادکاروں کے ذریعے جنہوں نے، بقول اہلِ سندھ، سندھ کی بہترین زمینوں پر "قبضہ" کر لیا۔ اور کچھ ان پنجابی صنعت کاروں اور تاجروں کے ذریعے جو خصوصاً کراچی کی صنعت و تجارت کے قابلِ لحاظ حصے پر "قابض" ہو گئے۔ (واضح رہے کہ سول اور فوجی افسروں کو جو زمینیں "باندازِ خسروانہ" سندھ میں نئے تعمیر شدہ بیراجوں سے سیراب ہونے والے علاقوں میں مرحمت فرمائی گئیں، ان کا مسئلہ جداگانہ اور اُس نئے نوآبادیاتی نظام کا شاخسانہ ہے جس کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے۔)

موجودہ صورتِ حال کے کامل فہم و شعور کے لئے یہ ضروری ہے کہ یہ بھی نوٹ کر لیا جائے کہ جواباً ایک عام پنجابی سندھیوں کو سست اور کاہل، اور آرام پسند اور نااہل، اور سفر سے خوف کھانے والا ہی نہیں بزدل اور ڈرپوک بھی سمجھتا ہے! (اگرچہ ۸۳ء اور ۸۶ء کے اندرونِ سندھ ہنگاموں اور سندھ میں ڈاکوؤں کی حالیہ ترک تازیوں نے کم از کم مؤخر الذکر تاثر کو بہت حد تک ختم کر دیا ہے!)

اس صورتِ حال کا اہم ترین سبب تو سندھ اور پنجاب کے قدیم تاریخی پس منظر اور بالخصوص انگریزی دور میں پیدا شدہ اجتماعی نفسیات کے اُس فرق و تفاوت کے پیشِ نظر بآسانی سمجھا جا سکتا ہے جس پر اس سے قبل تفصیلی روشنی ڈالی جا چکی ہے ___ یعنی یہ کہ چونکہ انگریزوں نے سندھیوں میں نفرت و عداوت ہی نہیں بغاوت کے جذبات محسوس کئے لہٰذا اس نے اپنی فوج کے دروازے بھی ان پر بالکل بند کر دیئے اور اس کی وجہِ جواز کے طور پر یہ مشہور کر دیا کہ سندھی بزدل اور غیر عسکری قوم (NON-MARTIAL RACE) ہیں اور تعلیم کے میدان میں بھی سندھ میں کوئی خاص پیش رفت نہیں کی جس کے نتیجے میں انگریزی فوج میں تو سندھیوں کا

تناسب صفر رہا ہی، عام تعلیم کے میدان میں بھی سندھی مسلمان بحیثیت مجموعی پیچھے رہ گئے۔ اور ایک تو عام سندھی ویسے ہی خاموش اور شرمیلا اور اپنی قدیم تہذیبی روایات کے زیر اثر کچھ لئے دیئے اور الگ تھلگ (RESERVED) رہنے والا تھا، اس پر مستزاد مسلسل ایک سو سال کے مخالفانہ پروپیگنڈے کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اپنے خول میں بالکل ہی بند ہو کر رہ گیا اور کم از کم وقتی طور پر اس کے اندر حدودِ سندھ سے باہر کسی قسمت آزمائی (ENTERPRISE) کا رجحان نہ رہا۔ حالانکہ اس سے قبل خصوصاً خلیج کے علاقے اور حجاز مقدس کے ساتھ سندھیوں کے تجارتی روابط بہت مضبوط تھے، چنانچہ جب ۱۹۶۲ء میں پہلی بار حج کی سعادت نصیب ہوئی تو راقم الحروف نے مکہ مکرمہ کے بازاروں میں سائن بورڈوں پر "السندی" کا لفظ بکثرت لکھا دیکھا اور دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ لوگ سندھی تو ہیں لیکن چونکہ انہیں وہاں سے نقلِ مکانی کئے کئی نسلیں بیت گئی ہیں لہٰذا یہ معلوم نہیں کہ وہ سندھ کے کس شہر سے عرب آئے تھے۔! (واضح رہے کہ بالکل یہی معاملہ بہت سے بہاری مسلمانوں کا ہے جو جزائر غرب الہند (WEST INDIES) میں آباد ہیں لیکن کئی نسلیں بیت جانے کے باعث اب انہیں اپنے جدی وطن کا نام بھی صحیح یاد نہیں ہے۔ اور وہ 'بہار' کا تلفظ 'بیار' کرتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انگریز کی آمد کے بعد یا تو کچھ حریت پسند لوگ از خود ہجرت کر کے دنیا کے دوسرے حصوں میں چلے گئے تھے۔ یا انگریزوں نے ان میں بغاوت کے جراثیم دیکھ کر ان کو جہازوں میں بھر بھر کر قریب کے "کالے پانی" کے بجائے ایک نہایت دور کے 'کالے پانی' بھیج دیا۔ چنانچہ اس علاقے کے ایک مسلمان سے جب امریکہ میں ملاقات ہوئی تو اس نے بعینہ یہی بات کہی۔ راقم کا گمان غالب ہے کہ کچھ اسی طرح کا معاملہ سندھ میں پیش آیا کہ انگریز کی آمد پر کچھ حریت پسند سندھی عرب ہجرت کر گئے اور تین چار نسلوں کے بعد اب انہیں ان شہروں کے نام بھی یاد نہیں رہے جن سے انہوں نے نقل مکانی کی تھی)۔

اس کے برعکس پنجابیوں کے لئے انگریز نے نہ صرف یہ کہ اپنی فوج کے دروازے چوپٹ کھول دیئے بلکہ ان کی باضابطہ حوصلہ افزائی کی، مزید برآں ان ہی میں سے اپنی سول سروس کے لئے بہترین کل پرزے حاصل کرنے کے لئے سکولوں اور کالجوں اور خصوصاً مشنری

اداروں کا جال پنجاب بھر میں پھیلا دیا۔ اُدھر پنجابیوں نے بھی بحیثیت مجموعی بدیسی حکمرانوں کی ان نوازشوں کا پوری خوشدلی اور قلبی و ذہنی آمادگی کے ساتھ خیر مقدم کیا اور اس طرح انگریز کی سول سروس اور فوج میں پنجابی مسلمانوں کو اہم مقام حاصل ہو گیا۔ اور اگرچہ اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے اپنی اس پوزیشن سے تحریک مسلم لیگ کو تقویت پہنچائی اور قیامِ پاکستان کے ضمن میں مؤثر رول ادا کیا ــــ لیکن اس کا یہ نتیجہ بہرحال نکلا کہ انگریز کے رخصت ہونے اور خصوصاً قائداعظم کے انتقال کے بعد جو لوگ "تاج و تختِ" حکومتِ پاکستان کے وارث بنے یعنی مرکزی بیوروکریسی کے ارکان اور فوج کے جرنیل ان میں اہلِ پنجاب کا پلڑا سب سے بھاری تھا۔ چنانچہ وہی اس نئے "دیسی سامراج" کے سربراہ یا علامت بن گئے۔

یہی وجہ ہے کہ مغربی پاکستان میں ون یونٹ کے قیام کو بھی، جو اصلاً پاکستان کے مشرقی اور مغربی خطوں کے مابین لاینحل دستوری مسئلے کا واحد ممکن حل تھا، سندھ میں اسی نظر سے دیکھا گیا کہ یہ پنجابی سامراج کے پورے مغربی پاکستان پر فیصلہ کن اور بلا شرکتِ غیرے قبضے کی آخری اور بھرپور کوشش ہے۔ اور بدقسمتی سے پاکستان کی اس وقت کی بے بصیرت قیادت نے وَن یُونٹ کا صدر مقام لاہور کو قرار دے کر اس کا ثبوت بھی فراہم کر دیا ــــ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ اگر وَن یُونٹ کا صدر مقام ملتان کو بنایا جاتا جو لسانی اور ثقافتی، اور جغرافیائی اور مواصلاتی ہر اعتبار سے مغربی پاکستان کا مرکز تھا تو اتنا شدید ردِّعمل ہرگز پیدا نہ ہوتا۔

حاصل کلام یہ کہ ــــ اصولی اور مجموعی اعتبار سے پنجاب سے سندھ کی شکایات بے بنیاد نہیں ہیں۔ اگرچہ، جیسے کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے، اس ضمن میں اصل موردِ الزام پوری پنجابی قوم نہیں بلکہ اس کے صرف دو طبقے بنتے ہیں ــ یعنی ایک فوج جو اکثر و بیشتر پنجاب کے صرف شمالی حصے سے تعلق رکھتی ہے اور دوسرے سول بیوروکریسی جو زیادہ تر بھارتی اور پاکستانی پنجاب کے وسطی اضلاع سے ہے۔ بقیہ پورے پنجاب کو بحیثیت مجموعی اور مذکورہ حصوں کے بھی عام لوگوں کو موردِ الزام ٹھہرانا یقیناً زیادتی ہے ــ

اسی طرح ان زمینوں سے قطع نظر جو اسی سول اور ملٹری بیوروکریسی نے بطورِ "انعام" غصب کیں، ان تمام پنجابی آبادکاروں کو ملعون کرنا یقیناً بہت بڑی ناانصافی ہے جنہیں قدرت

نے بنجر اور غیر آباد زمینوں کو آباد کرنے اور اُن سے بطور "رزقِ خود را از زمیں برچیدن رواست"
کے مصداق اپنے اور اہلِ وطن کے لئے غذا حاصل کرنے کی بے پناہ صلاحیت سے نوازا ہے
اور جنہیں ابتدا میں تو بڑی تحریص و ترغیب یہاں تک کہ منّت خوشامد کے ساتھ سندھ لایا
گیا تھا!

اس ضمن میں بھی اس تاریخی پس منظر کی وضاحت مفید ہوگی کہ انگریزوں کے تعمیر کردہ
نہری آبپاشی کے نظام سے قبل مغربی پنجاب کے بھی اکثر و بیشتر حصّے کی معیشت اور وہاں کے
رہنے والوں کی مزاجی کیفیت بالکل ویسی ہی تھی جیسی اہلِ سندھ کی ـــــ یعنی چونکہ علاقہ اکثر و بیشتر
بنجر اور صحرائی تھا اور زرعی معیشت کا کل دار و مدار دریاؤں کی طغیانی کے ذریعے سیراب ہونے
والی زمینوں پر تھا یا کچھ تھوڑا بہت بارانی کاشت پر، لہٰذا زیادہ محنت و مشقّت کا مادّہ نہ یہاں
کے لوگوں میں تھا نہ وہاں کے لوگوں میں اور توکّل و قناعت کا دَور دورہ وہاں بھی تھا اور
یہاں بھی ـــــ اس کے برعکس سابق متحدہ پنجاب کے تلہیٹی کے علاقے یعنی سیالکوٹ، گورداسپور،
امرتسر، جالندھر اور ہوشیارپور کے اضلاع بے حد سرسبز بھی تھے اور گنجان آباد بھی۔ چنانچہ
یہاں کے لوگوں میں (بشمول سکھ اور مسلمان) زراعت اور کاشت کاری کی بے پناہ مہارت
اور استعداد پیدا ہوگئی۔ اور چونکہ آبادی میں اضافے کی بنا پر رفتہ رفتہ رقبے چھوٹے چھوٹے
رہ گئے تھے لہٰذا ـــــ ایک جانب تھوڑی سی زمین سے زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کرنے
کی جدّ و جہد نے ان کی زراعت میں مہارت میں مزید اضافہ کیا، دوسری طرف متبادل ذرائع
معاش کی تلاش نے لوگوں کو نہ صرف عام تعلیم بلکہ فنّی اور پیشہ ورانہ مہارت کے حصول کی طرف
متوجہ کیا، یہی وجہ ہے کہ پنجاب نے جو بہترین بیوروکریٹ اور ٹیکنوکریٹ پیدا کئے اُن کی
اکثریت کا تعلق اسی علاقے سے ہے۔ اور تیسری طرف حصولِ معاش کے لئے نہ صرف اپنے
ملک کے دوسرے علاقوں بلکہ ملک سے باہر جا کر قسمت آزمائی کرنے پر بھی آمادہ کیا۔

یہی وجہ ہے کہ جب وسطی اور مغربی پنجاب میں نہروں کا جال پھیلا اور نئے آبادکاروں کی
ضرورت پیش آئی تو ان ہی علاقوں کے لوگ ترکِ سکونت کر کے آئے اور انہوں نے کمال محنت
و مشقّت اور مہارت و اہلیت کا ثبوت دیتے ہوئے ان علاقوں کو آباد کیا۔ اور اس کام میں

پنجاب کے ان علاقوں میں پہلے سے رہنے والے لوگوں نے کم از کم ابتدائی دَور میں کوئی حصّہ نہیں لیا۔ بعد میں جب سابق ریاست بہاولپور اور اَپر سندھ میں نہریں نکلیں اور بیراج بنے تو بعینہٖ یہی صورت وہاں بھی پیش آتی رہی۔ اور سندھ کے سابق قناعت پسند اور آرام طلب لوگوں نے بھی بالکل مغربی پنجاب کے پُرانے باشندوں کی طرح ان پنجابی آبادکاروں کو حیرت و استعجاب کے ساتھ بالکل مٹّی ہو کر مٹّی میں ملتے دیکھا —— لیکن جب ان کی محنت و مشقّت کے نتائج برآمد ہوئے اور زمینوں نے سونا اگلنا شروع کر دیا تو انسان کی طبعی کمزوری کے باعث منفی جذبات پیدا ہونے شروع ہو گئے۔ حالانکہ سندھی بھائیوں کو سوچنا چاہیئے کہ اپنی محنت و مشقّت کی عادت کے بَل پر یہ پنجابی آبادکار اور محنت کش صرف سندھ ہی میں نہیں بلکہ دُنیا کے کونے کونے حتّٰی کہ امریکہ اور کینیڈا کے مغربی ساحل تک پر موجود ہیں۔

بالکل اسی طرح کا معاملہ پنجابی صنعت کاروں اور تاجروں کا ہے۔ عجیب بات ہے کہ آبادکاروں کے برعکس پنجاب کی تاجر برادریوں کی اکثریت کا تعلق مغربی پنجاب سے ہے، یعنی چنیوٹ، چکوال، پنڈ دادنخان، جھنگ اور ملتان کی شیخ برادریاں، اور ان لوگوں کو اللہ نے تجارت کی جو مہارت عطا فرمائی ہے اس کے طفیل یہ لوگ تقسیم ہند سے بہت پہلے پنجاب سے نکل کر دہلی اور یوپی، حتّٰی کہ بنگال تک کی تجارت میں نمایاں حصّہ دار بن گئے تھے۔ ان میں سے بعض برادریوں مثلاً چنیوٹی شیخوں نے تو اپنی پنجابی زبان اور ثقافت کو بھی برقرار رکھا اور اپنے آبائی شہروں سے بھی تعلق رکھّا اور بعض برادریوں نے (جن کا مجموعی نام "قوم پنجابی سوداگران دہلی" ہے) بالکلیہ یوپی ہی کی طرزِ معاشرت اور اردو زبان کو اختیار کر لیا چنانچہ اب وہ صرف نام کے پنجابی رہ گئے ہیں —— اب اگر ان لوگوں نے قیام پاکستان کے بعد گجرات کے میمنوں اور بمبئی کے خوجوں اور بوہروں کے ساتھ ساتھ اپنی محنت اور مہارت کی جولانگاہ کراچی اور سندھ کو بنایا تو اس میں کون سے جرم کی بات ہے —— اگرچہ یہ بحث بالکل جُدا ہے کہ موجودہ سرمایہ داری اور ارتکازِ دولت میں اصل محنت و مہارت کا حصّہ کتنا ہے اور سودی اور ساہوکاری نظام، غیر شرعی بیع و شراء، سرکاری واجبات کی چوری اور سب سے بڑھ کر رشوت اور بددیانتی کا حصّہ کتنا! —— اس لئے کہ یہ معاملات افراد و اشخاص سے نہیں بلکہ "نظام"،

سے متعلق ہیں اور اِن کا تعلق کسی ایک قوم یا قومیت سے نہیں بلکہ پوری پاکستانی قوم اور معاشرے سے بحیثیتِ مجموعی ہے اور اِن خباثتوں کا کلی علاج بھی ایک کامل اسلامی انقلاب کے بغیر ناممکن ہے، جس کے بعد زمین کا بھی شریعتِ اسلامی کے مطابق بالکل "نیا بندوبست" ہوگا اور "سرمایہ کاری" کے لئے صحت مند فضا کے برقرار رہتے ہوئے "سرمایہ داری" کی جملہ راہیں بھی مسدود ہو جائیں گی۔

لہٰذا سندھی بھائیوں کو پنجاب اور اہلِ پنجاب کے خلاف اپنے "مقدمے" پر نظرِثانی کرنی چاہیئے اور معاملہ فی الواقع جیسا کچھ اور جتنا کچھ ہے اسی حد تک رکھنا چاہیئے اور جذبات کی رَو میں بہہ کر اس میں غلط اضافے نہیں کر لینے چاہئیں!

اسی طرح، پنجابیوں کا بھی ایک مغالطہ تو، جیسے کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے، رفع ہو ہی گیا ہے، یعنی یہ کہ سندھی لڑاکا یا بہادر قوم نہیں ہیں، اس پورے تاریخی پس منظر کے سامنے آجانے کے بعد باقی غلط فہمیاں بھی رفع ہو جانی چاہئیں اور اپنے سندھی بھائیوں کی عظمت کا نقش ان کے دل پر قائم ہو جانا چاہیئے کہ انہوں نے انگریزی حکومت کو ایک دن کے لئے بھی ذہناً قبول نہیں کیا۔ بلکہ ۱۹۴۵ء تک جب کہ سندھ پر انگریزوں کے تسلّط کو ایک صدی سے زیادہ عرصہ گذر چکا تھا سندھ کے "حُر"، اپنے خون سے حریّت پسندی کی داستانیں رقم کر رہے تھے یہاں تک کہ انگریزوں نے موجودہ پیر پگاڑا صاحب کے والد ماجد ایسی عظیم دینی و روحانی شخصیت کو نہ صرف یہ کہ موت کی سزا دی بلکہ ان کا جسدِ خاکی بھی اس لئے واپس نہیں کیا کہ انہیں یقین تھا کہ ان کا مزار جہاں بھی ہوگا تحریکِ حریّت و جہاد کا عظیم مرکز بن جائے گا!

پھر یہ سندھ کی اسی حریّت پرور فضا کا ثمرہ ہے کہ اس نے قائدِاعظم محمد علی جناح ایسی عظیم شخصیت کا تحفہ پوری ملتِ اسلامیہ پاک و ہند کی خدمت میں پیش کیا ـــــ مزید برآں پاکستان کے موجودہ صوبوں میں سے سندھ ہی وہ واحد صوبہ تھا جہاں مسلم لیگ کی حکومت قائم ہوئی ـــــ بلکہ ہندوستان کے پورے طول و عرض میں سندھ ہی وہ واحد صوبہ تھا جس کی اسمبلی نے ۱۹۴۳ء میں پاکستان کے حق میں قرارداد پاس کی تھی۔ الغرض! بّرِ عظیم پاک وہند

ہیں صوبۂ سندھ نہ مسلمانوں کی سیاسی بیداری کے اعتبار سے کسی سے پیچھے تھا نہ خود اختیاری کی جد وجہد میں، بلکہ واقعہ اس کے بالکل برعکس یہ ہے کہ ان جملہ اعتبارات سے سندھ کم ازکم موجودہ پاکستان کے تمام علاقوں سے تو بہت آگے تھا!

گویا اصل ضرورت اس کی ہے کہ ایک دوسرے کو سمجھا جائے، ایک دوسرے کی خوبیوں کا اعتراف کیا جائے اور ایک دوسرے کی خامیوں اور کوتاہیوں پر باہم طعنہ زنی کی بجائے ان کے اسباب وعلل کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایک دوسرے سے ہمدردی کی جائے [1]

بمصداق آیۂ قرآنی:

يَاۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰۤى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰۤى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ بِئْسَ الْاِسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَاُولٰۤئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝

ترجمہ "اے ایمان والو! تم میں سے کوئی قوم دوسری قوم کا مذاق نہ اڑائے، کیا عجب کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ نہ ہی کوئی عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں، ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں اور اپنے آپ کو عیب مت لگایا کرو، نہ ہی ایک دوسرے کے (چڑانے والے) نام رکھ لیا کرو۔ ایمان کے بعد تو برائی کا نام بھی بُرا ہے۔ اور جو باز نہیں آئے گا تو وہی لوگ ظالم قرار پائیں گے۔" (سورۂ حجرات: آیت ۱۱)

---

[1] یاد ہوگا کہ کچھ عرصہ قبل امیر جماعتِ اسلامی میاں طفیل محمد کے کسی بیان میں سندھیوں کے فوج میں بھرتی نہ ہونے کا ذکر طعن آمیز انداز میں تھا جس کے جواب میں سید غلام مصطفیٰ شاہ صاحب نے کہا تھا "ہمیں فخر ہے کہ ہم کبھی کرائے کے فوجی نہیں رہے۔!" گویا "دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی!"

۳۔ مہاجرین کا خوف

سندھ کی قدیم آبادی میں تیسرا احساسِ محرومی ہندوستان کے مختلف علاقوں سے ترکِ وطن کرکے پاکستان آنے والوں یعنی ”مہاجرین“ کی وجہ سے پیدا ہوا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ متعدد اسباب کی بنا پر مہاجرین کا ”خوف“ بھی قدیم سندھیوں کی اجتماعی نفسیات کا جزوِ لاینفک بن گیا ہے۔

ان اسباب میں سے بھی اوّلین تو یہی تھا کہ پاکستان کی مرکزی حکومت پر ابتداءً مہاجرین کا ”غلبہ“ تھا اور نہ صرف یہ کہ پہلی مرکزی کابینہ میں سب سے بڑی تعداد مہاجرین کی تھی اور مرکزی بیوروکریسی میں بھی وہ معتدبہ تعداد میں موجود تھے (چنانچہ جب تک مرکزی دارالحکومت کراچی میں رہا دیکھنے والوں کو یہی محسوس ہوا کہ پاکستان پر مہاجرین کی ”حکومت“ ہے) بلکہ سندھ کی عمومی تعلیمی پسماندگی کی بنا پر صوبائی محکموں میں بھی مہاجرین کا پلڑا بھاری تھا اور ایک عام دیہاتی سندھی بھی یہی محسوس کرتا تھا کہ مہاجر ہم پر حاکم ہو گئے ہیں، اگرچہ بعد میں یہ صورتحال تیزی سے تبدیل ہو گئی۔

ثانیاً ـــــ ہندوؤں کے ترکِ وطن سے، اگرچہ وہ جزوی تھا، جو معاشی اور اقتصادی خلا پیدا ہوا وہ بھی لامحالہ مہاجرین ہی کے ذریعے پُر ہوا، چنانچہ ایک جانب سندھ کی شہری جائداد اور تجارت پر مہاجرین کا ”قبضہ“ ہو گیا ـــ تو دوسری جانب سندھ کی وہ چالیس فی صد کے لگ بھگ زرعی زمین بھی، جو ہندوؤں نے مقامی مسلمانوں سے اپنے سودی اور ساہوکارانہ ہتھکنڈوں کے ذریعے ہتھیالی تھی، متروکہ جائداد کی حیثیت سے مہاجرین کو الاٹ ہو گئی[1] (اگرچہ اب سندھی نیشنلزم کے دباؤ کے تحت مہاجرین اس زرعی زمین کا اکثر و بیشتر حصہ یا تو اونے پونے بیچ چکے ہیں یا ویسے ہی چھوڑ دینے پر مجبور ہو چکے ہیں۔)

اس ضمن میں یہ بات اہمیت کے ساتھ نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ سندھ میں ہندوؤں

---

[1] اس سلسلے کی تلخ ترین حقیقت یہ ہے کہ تقسیمِ ہند سے قبل ہندو بنیوں (باقی اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

نے انگریزوں کی زیرِ سرپرستی اور ان کی باضابطہ حوصلہ افزائی اور تائید و امداد سے (جس کا سبب وہی تھا جو پہلے بیان ہو چکا، یعنی یہ کہ چونکہ انگریز سندھی مسلمان سے شدت سے خائف تھا اور اُسے اُس میں بغاوت کے جراثیم نظر آتے تھے، لہٰذا اُس نے اسے دبانے کے لئے ہندو کی حوصلہ افزائی کی) معاشی استحصال کا جو جال پھیلایا تھا اس کی بنا پر سندھ کے باشعور مسلمان اُن سے سخت نالاں تھے۔ چنانچہ یہ بات بہت سے لوگوں کے لئے حیرت واستعجاب کا باعث ہوگی کہ، پاکستان کے ایک قومی روزنامے[1] میں حال ہی میں شائع ہونے والے مضمون کے مطابق، قیامِ پاکستان سے لگ بھگ چار سال قبل اس شخص نے جو آج سندھی نیشنلزم کا سب سے بڑا علمبردار اور "مہاجر و پنجابی سامراج" سے نفرت و عداوت کی سب سے بڑی علامت، بن چکا ہے سندھی ہندوؤں کی دہائی دیتے ہوئے ہندوستان کے مسلمانوں کو دعوت دی تھی کہ وہ سندھ آ کر یہاں کے مسلمانوں کو ہندوؤں کی چیرہ دستیوں سے نجات دلائیں۔ چنانچہ اواخر دسمبر ۱۹۴۳ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا جو سالانہ اجلاس قائداعظم مرحوم کی زیرِ صدارت کراچی میں منعقد ہوا تھا اس میں تقریر کرتے ہوئے استقبالیہ کمیٹی کے چیئرمین جی ایم سیّد نے کہا تھا:

(تسلسل) اور ساہوکاروں کی دست بُرد سے زمینداروں کو بچانے کی جو کوششیں پنجاب میں سر چھوٹو رام اور ان کے ساتھیوں نے کی تھیں، اسی طرح کی ایک کوشش سندھ میں بھی صوبائی اسمبلی کے بعض مسلمان اراکین نے کی تھی۔ لیکن اس موقع پر بہت سے نام نہاد مسلمان وڈیرے ہندو سرمایہ داروں کے ہاتھوں بک گئے اور انہوں نے طرح طرح کے تاخیری ہتھکنڈوں سے کام لے کر مجوّزہ بل کو پاس ہونے سے روک دیا۔ ورنہ وہ ساری زرعی زمینیں جو ہندو ساہوکاروں کے پاس رہن تھیں اور اسی بنا پر تقسیم کے بعد متروکہ جائداد قرار پا کر مہاجرین کو الاٹ ہوئیں اسی وقت سندھ کے مسلمانوں کو واپس مل جاتیں ــــــ واضح رہے کہ پنجاب میں تو زمیندار مسلمان بھی تھے اور ہندو اور سکھ بھی تھے، لیکن سندھ میں کوئی غیر مسلم اصلاً زرعی زمین کا مالک نہیں تھا اور زرعی اراضی کُل کی کُل مسلمانوں کی ملکیت تھیں!

[1] روزنامہ "نوائے وقت"، تحریر جناب محمد علی

"ہندو سندھ میں رہنے کے باوجود بھارت کے ہندوؤں سے تعلقات رکھتے ہیں، اس لئے سندھ کے مسلمان بھی امید رکھتے ہیں کہ برِصغیر کے مسلمان ان (یعنی سندھی مسلمانوں) کے ساتھ اشتراکِ عمل کریں گے۔ بھارت کے مسلمان ہماری بڑی مدد کرسکتے ہیں۔ سندھ کے رہنے والے زراعت سے وابستہ ہیں اور تجارت میں بہت پیچھے ہیں۔ اس لئے بھارت کے مسلمان سندھ میں آکر اپنے تجربے اور مہارت سے تجارت میں سندھی مسلمانوں کی پس ماندگی کو ختم کرسکتے ہیں اور سندھ خوشحالی اور ترقی کی راہ پر گامزن ہوسکتا ہے۔"

لیکن اوّل تو اس وقت یہ ایک خالص نظری سی بات تھی اور اس کا حقیقت و واقعہ کا روپ دھار لینا بہت ہی بعید از قیاس تھا۔ پھر یہ تو کسی طرح بھی اندازہ نہیں کیا جاسکتا تھا کہ تبادلۂ آبادی اتنے بڑے پیمانے پر ہو جائے گا۔ لہٰذا اس میں مضمر 'خطرات' کی طرف اور کسی کا تو کیا خود جی ایم سیّد صاحب کا ذہن بھی منتقل نہیں ہوسکا ــــ چنانچہ یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ قیامِ پاکستان کے فوراً بعد سندھ میں آنے والے مہاجرین کا سندھی مسلمانوں نے نہایت پُرتپاک خیر مقدم کیا اور انہیں تمام ممکن سہولتیں اور مراعات بہم پہنچائیں لیکن افسوس کہ یہ کیفیت زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی اور دو اہم اسباب کی بنا پر اوّلاً 'ضدِ عروج' (ANTI-CLIMAX) اور پھر ضابطہ ردِّ عمل (REACTION) کی صورت پیدا ہوتی چلی گئی۔

اوّلاً اس بنا پر کہ ــــ بھارت سے ہجرت کرکے آنے والوں کا معاملہ ۱۹۴۸ء یا ۱۹۴۹ء ہی میں ختم نہیں ہوگیا۔ بلکہ یہ سلسلہ اس کے بعد بھی تواتر کے ساتھ جاری رہا اور اس طرح آبادی میں مہاجرین کا تناسب مسلسل بڑھتا چلا گیا۔ نتیجۃً قدیم سندھیوں کے تحت الشعور میں یہ 'خوف' کلبلانے لگا کہ کہیں وہ اپنے ہی صوبے میں اقلیت بن کر نہ رہ جائیں۔ اس جلتی آگ پر تیل کا اثر ہوا اس سے کہ جب پاکستان میں صنعت نے تیزی کے ساتھ ترقی کی اور اس کا سب سے بڑا مرکز کراچی بن گیا تو پاکستان کے شمالی صوبوں سے پنجابی اور پٹھان محنت کاروں کی سندھ منتقلی کی رفتار بھی بہت بڑھ گئی اور مہاجرین، پنجابیوں اور پٹھانوں کی مجموعی تعداد قدیم سندھیوں کی تعداد کے تقریباً برابر ہوگئی ــــ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ خوف بھی جو ابتدا میں صرف 'مہاجر فوبیا' (PHOBIA) تھا دہ چند ہوگیا۔ چنانچہ اب قدیم سندھی برملا اس خطرے کا اظہار

کر رہے ہیں کہ آخر یہ صورت جاری رہی تو ان کا حشر ریڈ انڈین لوگوں کا سا ہوگا اور اگرچہ اس میں یقیناً حد درجہ مبالغے کا عنصر شامل ہے تاہم قدیم سندھیوں کے اپنے ہی صوبے میں اقلیت میں تبدیل ہو جانے کا اندیشہ بے بنیاد نہیں ہے، چنانچہ محولہ بالا مضمون کے مطابق:

"ایک ریٹائرڈ سندھی سی ایس پی آفیسر کے تحقیق و تجزیئے میں کہا گیا ہے کہ کراچی میں ہر سال ڈھائی لاکھ کے حساب سے پنجاب اور سرحد سے افراد آ رہے ہیں۔ اگر یہی رفتار برقرار رہی تو ۱۹۹۱ء تک سندھ میں پنجابی بولنے والوں کی آبادی پچاسی لاکھ پانچ ہزار چار سو دس ہوگی ۱۹۹۱ء تک پشتو بولنے والوں کی تعداد چوبیس لاکھ ہوگی۔ ۱۹۹۱ء میں اردو بولنے والوں کی تعداد اٹھانوے لاکھ چار ہزار دو سو بیس ہوگی۔ ۱۹۹۱ء تک پانچ لاکھ کشمیری سندھ میں آباد ہوں گے۔ اگر آبادی کی منتقلی کی یہی صورت حال رہی تو سندھ کی کل آبادی چار کروڑ چھبیس لاکھ ہوگی جس میں سندھی بولنے والے دو کروڑ نو لاکھ، پنجابی بولنے والے پچاسی لاکھ، پشتو بولنے والے ستائیس لاکھ اور اردو بولنے والے اٹھانوے لاکھ اور کشمیری پانچ لاکھ ہوں گے۔ اس طرح مجموعی طور پر آئندہ چند سالوں میں سندھی بولنے والے مستقل طور پر اقلیت میں تبدیل ہو جائیں گے۔"

تو اگرچہ یہ "خطرہ" مہاجروں، پنجابیوں اور پٹھانوں کی مجموعی تعداد سے ہے، لیکن چونکہ اس غیر سندھی آبادی کا جزوِ اعظم بہرحال مہاجرین ہی پر مشتمل ہے، لہٰذا اس سے پیدا شدہ احساسِ محرومی اور نفرت و عداوت کا سب سے بڑا حصہ بھی لامحالہ ان ہی کے ساتھ منسلک ہو گیا ہے۔

چنانچہ یہی پس منظر ہے اس انتہائی تکلیف دہ اور افسوسناک صورتِ حال کا کہ قدیم سندھی مسلمان ان بہاری مسلمانوں کی منتقلی کا نام سننا بھی گوارا نہیں کرتے جنہیں اپنے "پاکستانی" ہونے پر اصرار ہے اور جو اس وقت بنگلہ دیش میں انتہائی ذلت و افلاس اور کس مپرسی کے عالم میں زندگی کے دن گن رہے ہیں، اور منتظر ہیں کہ کب پاکستانی مسلمانوں کو رحم آئے اور انہیں بھی آزاد اور باوقار زندگی گذارنے کا موقع ملے۔ اس لئے کہ سندھی مسلمانوں کو یقین ہے کہ خواہ اس وقت پاکستان کے دوسرے صوبوں کے لوگ کتنی ہی فراخدلی کا مظاہرہ کریں اور ان بہاریوں

کو اپنے یہاں آباد کرنے کی پیشکش کریں، وہ جلد یا بدیر لازماً سندھ ہی منتقل ہو کر رہیں گے اور اسطرح آبادی کا توازن مزید بگڑ جائے گا۔

ثانیاً ـــــ راقم کے تجزیے کے مطابق قدیم سندھیوں کے "خوف" میں تناسبِ آبادی اور دیگر معاشی و اقتصادی عوامل سے بھی کہیں زیادہ دخل لسانی اور ثقافتی عوامل کو حاصل ہے۔ اس لئے کہ انہیں شدید اندیشہ لاحق ہے کہ کہیں وہ قدیم سندھی تہذیب و ثقافت اور زبان و ادب بالکل ختم ہو کر نہ رہ جائیں جو انہیں بے حد عزیز ہیں۔ اور چونکہ یہ اندیشہ انہیں نہ پنجابیوں سے ہے نہ پٹھانوں سے بلکہ صرف مہاجروں اور ان میں سے بھی خاص طور پر خالص اردو بولنے والوں سے ہے۔ لہٰذا اس کے حصّے کا ردِّ عمل تو بالکلیہ ان ہی کے حصّے میں آیا ہے ـــــ اِدھر اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں ہے کہ کراچی تو سرے سے سندھ کا شہر معلوم ہی نہیں ہوتا، حیدر آباد اور سکھر جیسے سندھ کے دوسرے بڑے شہروں پر بھی اردو زبان اور مہاجر تہذیب کا صریح غلبہ ہے، رہے باقی نسبتاً چھوٹے شہر تو ان میں بھی سندھی اور اردو دو زبانیں اور مہاجر اور مقامی تہذیبیں ایک دوسرے کی مدِّمقابل اور بالکل برابر کی چوٹ نظر آتی ہیں۔ لہٰذا قدیم سندھی زبان و ادب اور تہذیب و ثقافت کو درپیش خطرہ وہمی اور خیالی نہیں حقیقی اور واقعی ہے۔ چنانچہ اسی کو ملک و ملّت کے دشمنوں نے سب سے بڑھ کر استعمال (EXPLOIT) کیا اور اس "خوف" کو اُس جدید سندھی نیشنلزم کا سب سے بڑا جذبۂ محرّکہ بنا دیا جس نے بچے کھچے پاکستان کی سالمیت کے لئے سب سے بڑے خطرے کی صورت اختیار کر لی ہے۔ (واضح رہے کہ خوف کے جذبے کی بنیاد پر دنیا میں بڑی انہونی باتیں بھی ہو جاتی ہیں، چنانچہ خود پاکستان کے قیام کے اسباب و عوامل میں سب سے مؤثر عامل ہندوستان کی مسلم قوم کا یہ "خوف" ہی تھا کہ ہندو اس سے نہ صرف یہ کہ انصاف نہیں کرے گا بلکہ ہو سکتا ہے کہ اپنی ہزار سالہ غلامی کا انتقام لے!) ـــــ اور چونکہ قدیم سندھی مسلمانوں کی جدید اجتماعی نفسیات کے اس پہلو پر عام طور پر توجہ نہیں دی جاتی اور یہ بات خاص طور پر پنجاب کے مسلمانوں کے تو بالکل سمجھ ہی میں نہیں آتی لہٰذا اس کے ضمن میں قدرے تفصیل کی ضرورت ہے۔

اس سلسلے میں آوّلین اور اہم ترین حقیقت تو یہ پیشِ نظر رہنی چاہیئے کہ پنجاب اور سندھ میں تبادلۂ آبادی کی نوعیت اور اس سے پیدا شدہ صورتِ حال ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہے (بقیہ دو صوبوں یعنی سرحد اور بلوچستان تک تو مہاجرین کی بالکل نہ ہونے کے برابر تعداد ہی پہنچی لہٰذا ان کے ذکر کی کوئی ضرورت نہیں ہے) اس لئے کہ اگرچہ آبادی کے تناسب کے اعتبار سے ان دونوں صوبوں میں تبادلۂ آبادی تقریباً ایک ہی پیمانے پر ہوا، لیکن پنجاب میں صورت یہ بنی کہ پنجابی بولنے والے ہندو اور سکھ گئے تو اُن کی جگہ جو لوگ آئے اُن کی غالب اکثریت پنجابی بولنے والوں ہی پر مشتمل تھی، مزید برآں اُن میں سے اکثر کے ہم قوم بلکہ قریبی رشتہ دار مغربی پنجاب میں پہلے ہی "آبادکاروں" کی صورت میں موجود تھے ——— صرف انبالہ ڈویژن (حالیہ ہریانہ اسٹیٹ) سے آنے والے لوگوں کی زبان و تہذیب قدرے مختلف تھی، لیکن ایک تو ان کی تعداد بہت کم تھی، دوسرے انہیں بارڈر کی طویل پٹی کے ساتھ ساتھ بہت منتشر صورت میں آباد کیا گیا ——— رہے خالص اردو بولنے والے دلی یوپی اور بہار وغیرہ کے مہاجرین تو پنجاب میں آباد ہونے والوں میں ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں تھی ——— لہٰذا پنجاب میں کوئی لسانی یا تہذیبی مسئلہ خالص عوامی اور دیہاتی سطح پر بھی پیدا نہیں ہوا۔ رہے پڑھے لکھے، روشن خیال اور باشعور شہری پنجابی تو وہ خواہ مغربی پنجاب سے تعلق رکھتے تھے خواہ مشرقی پنجاب سے، سب قیامِ پاکستان سے بہت پہلے اردو کو قومی زبان کی حیثیت سے قبول کر چکے تھے یہاں تک کہ پنجاب کے علمی و دینی اور تہذیبی و ثقافتی مرکز لاہور کو تقسیمِ ہند سے بہت قبل پورے ہندوستان میں اردو ادب و صحافت کے سب سے بڑے مرکز کی حیثیت حاصل ہو چکی تھی۔ نتیجۃً یہاں اعلیٰ ثقافتی سطح پر بھی کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوا ——— جب کہ اس کے بالکل برعکس سندھ میں سندھی بولنے والے ہندوؤں کی جگہ جو لوگ آئے ان میں غالب اکثریت تو دہلی، یوپی، بہار، سی پی اور حیدر آباد دکن کے خالص اردو بولنے والے لوگوں کی تھی، ان کے علاوہ راجپوتانہ سے آنے والوں کی زبان بھی اردو ہی تھی اگرچہ ذرا جھول اور گھِسی ہوئی، اور بمبئی، مدراس، کرناٹک اور کیرالا وغیرہ سے آنے والے بھی خواہ اپنے گھروں میں علاقائی

زبانیں بولتے ہوں گھر سے باہر اردو ہی بولتے ہیں ـــــــ اُدھر، جیسا کہ تفصیلاً عرض کیا جا چکا ہے، سندھی زبان و ادب اور تہذیب و ثقافت کی تاریخ بہت طویل اور ان کی جڑیں بہت گہری ہیں اور سندھیوں کو اپنی زبان اور تہذیب سے والہانہ عشق ہے اور وہ ان پر بجا طور پر فخر کرتے ہیں ـــــ لہٰذا یہاں اردو اور سندھی کے مابین ویسا ہی تصادم پیدا ہو گیا جیسا تقسیمِ ہند سے کچھ عرصہ قبل اردو اور ہندی کے درمیان پیدا ہوا تھا۔ جس کا ذکر علامہ اقبال کے ظریفانہ اشعار میں اس طرح ہے ؎

اے شیخ و برہمن سنتے ہو کیا اہلِ بصیرت کہتے ہیں   گردوں نے کتنی بلندی سے ان قوموں کو دے پٹکا ہے
یا باہم پیار کے جلسے تھے، دستورِ محبت قائم تھا!   یا بحث میں اردو ہندی ہے یا قربانی یا جھٹکا ہے

اردو اور سندھی کی اس بحث میں شدت اور تلخی پیدا کرنے میں، مہاجر بھائیوں سے معذرت کے ساتھ عرض ہے کہ، کچھ دخل ان کے ' احساسِ برتری ' اور اس کے جا و بیجا اظہار کو بھی حاصل ہے ـــــ چنانچہ وہ اہلِ سندھ کے بظاہر سادہ اور دیہاتی طور طریقوں میں مضمر اعلیٰ تہذیبی اقدار کو نہیں دیکھ پائے بلکہ انہوں نے دہلی، لکھنؤ اور حیدر آباد دکن کی تکلف سے مرصّع اور تصنّع سے مزیّن تہذیب ہی کو معیاری گردانتے ہوئے قدیم سندھیوں کو بنظرِ استحقار دیکھا، یہاں تک کہ اُن کا مذاق اڑانے سے بھی گریز نہیں کیا۔ (واضح رہے کہ یہ طرزِ عمل ان میں سے بعض زیادہ مہذّب و مثقّف لوگوں کا پنجابیوں کے ساتھ بھی رہا جنہیں وہ ازراہِ تفننِ طبع " پنجابی ڈھگے " کہتے رہے!) ـــــ اسی طرح انہوں نے اپنے ' اہلِ زبان ' ہونے کے گھمنڈ میں سندھی زبان و ادب کی جانب کوئی توجہ نہیں کی ـــــ اور اگرچہ اندرون سندھ مہاجرین کی نئی نسل اب سندھی زبان میں بلا تکلف گفتگو کر لیتی ہے لیکن ظاہر ہے کہ عام بول چال کی زبان کا استعمال اور شے ہے اور کسی زبان کے اعلیٰ ادب کا ذوق پیدا ہونا اور اس میں علمی و ادبی تحریر و تقریر پر قادر ہونا بالکل دوسری بات ہے ـــــ بہر حال اس کا ردِ عمل مقامی سندھی آبادی میں شدت کے ساتھ پیدا ہوا، اور یہی وہ چیز تھی جس کا سندھ کے ہندو مدت سے گھات لگائے انتظار کر رہے تھے ـــــ چنانچہ انہوں نے اس صورتِ حال سے بھرپور فائدہ اٹھایا ـــــ اور اس معاملے میں انہیں

کوئی ' دوش ' بھی نہیں دیا جاسکتا۔ اس لئے کہ انہوں نے ' بھارت ماتا ' کی تقسیم اور اسلام کے نام پر بننے والے ملک پاکستان کو ' ظاہر ہے کہ ' مجبوراً ہی گوارا کیا تھا۔ اور ان سے یہ توقع کوئی عقل و خرد سے بالکل عاری انسان ہی کرسکتا ہے کہ وہ پاکستان کو ذہنی یا قلبی طور پر قبول کرسکتے ہیں ـــــ لہٰذا مشرقی پاکستان کی تاریخ سندھ میں بھی دہرائی گئی۔ اور وہاں تو بنگلہ زبان و ادب کی راہ سے صرف ' مسلم قومیت ' یا دو قومی نظریے ہی پر ضرب لگائی گئی تھی جس سے پاکستان کے دولخت ہونے کی راہ ہموار ہوئی ' یہاں اس سے بھی آگے بڑھ کر ' نظریۂ پاکستان ' اور اسلام کے اساسی عقائد و نظریات پر وار کیا گیا جس کے نتائج آج روزِ روشن کے مانند نگاہوں کے سامنے موجود ہیں۔

تہذیب و ثقافت کے قدرے نظری و نفسیاتی معاملے کے ساتھ ساتھ زبان کے مسئلے کا ایک خالص مادّی اور مالیاتی پہلو بھی ہے ـــ اور وہ یہ کہ دنیوی ترقّی اور مسابقت کی دوڑ میں ' ظاہر بات ہے کہ ' وہ لوگ ہمیشہ آگے رہتے ہیں جو اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کر رہے ہوں ' بہ نسبت ان کے جنہیں کسی غیر مادری یا اجنبی زبان میں تعلیم حاصل کرنی پڑے۔ چنانچہ سندھیوں نے بالکل بجا طور پر محسوس کیا کہ اوّل تو وہ اس طویل تاریخی پس منظر کی بنیاد پر جس کا ذکر پہلے ہوچکا ہے' ویسے ہی تعلیم کے میدان میں پسماندہ ہیں' اب اگر مستقل طور پر اردو ہی ذریعۂ تعلیم بن گئی تو سندھی نوجوان ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اردو بولنے والوں سے پیچھے رہ جائیں گے ـــ یہی وجہ ہے کہ سندھ میں ' احساسِ محرومی ' سب سے پہلے نوجوان طلبہ ہی میں پیدا ہوا۔ اور خاص طور پر جب ۱۹۵۸ء میں جنرل محمد ایّوب خاں کے پہلے مارشل لا کے دوران سندھی طلبہ کو ' حکماً ' اردو پڑھنے پر مجبور کیا گیا تو سندھ کی نوجوان نسل میں شدید ناراضگی کی لہر دوڑ گئی جس نے رفتہ رفتہ غم و غصّے کے طوفان کی صورت اختیار کرلی۔

الغرض ! یہ ہے پاکستان میں عمومی سیاسی استبداد اور معاشی استحصال سے پیدا شدہ ملک گیر احساسِ محرومی پر مستزاد سندھ کی قدیم آبادی کی اضافی ناراضگی اور بے چینی و بے اطمینانی کا پس منظر جس نے اس ' **جدید سندھی نیشنلزم** ' کو وہ نہایت قوی لیکن منفی عوامل مہیّا کر دیئے ہیں جن نے پاکستان کی سالمیت کے لئے چیلنج کی حیثیت اختیار کرلی ہے

اور " باباۓ سندھ " مسٹر جی ایم سید کے قول کے مطابق پاکستان کی تاریخ کے طویل ترین مارشل لا ر نے ، جس کے " باقیات السیئات " تاحال برقرار ہیں ، اسے اتنی تقویت بخش دی ہے کہ اب علی الاعلان پاکستان کو توڑ دینے اور بھارت کے ساتھ کنفیڈریشن کی باتیں ہونے لگی ہیں ـــــ اور واقعہ یہ ہے کہ بظاہر احوال یہی نظر آتا ہے کہ اللہ کی کوئی خصوصی مشیت اور کوئی خاص خدائی تدبیر ہی پاکستان کی سالمیت کو برقرار رکھ سکتی ہے ! ـــــ اور اس پر بہرحال ہمارا پختہ ایمان ہے کہ اللہ " فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ " (سورۂ بروج : " جو ارادہ فرمالے اُسے بہرصورت پورا کرنے والا ! ") بھی ہے اور " غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ " (سورۂ یوسف آیت ۲۱ : " اپنے کام پر پوری قدرت رکھنے والا ! ") بھی ، اگرچہ اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے !! (وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ) ۔

مہاجرین کا رَدِّ عمل

ہندوستان "دو قومی نظریہ" کی بنیاد پر تقسیم ہوا تھا اور پاکستان کا قیام "مسلم قومیت" کی اساس پر عمل میں آیا تھا ــــ اور اس میں ہرگز کوئی شک نہیں ہے کہ یہ قائد اعظم محمد علی جناح کا عظیم کارنامہ تھا کہ انہوں نے اِس دَور میں جبکہ الحاد اور مادّہ پرستی کو پورے کرۂ ارضی پر فیصلہ کُن غلبہ حاصل ہے اور لادینیت اور وطنی قومیت سیاسیات کے "مسلّمات" میں سے ہیں اپنی خداداد ذہانت وقابلیت اور بے پناہ محنت ومشقت کے بل پر یہ حقیقت منوالی کہ "قومیت کی ہر تعریف کی رُو سے ہندوستان کے مسلمان ایک قوم ہیں!" قائد اعظم مرحوم کے اس کارنامے کی عظمت کا صحیح انکشاف اس وقت ہوتا ہے جب یہ حقیقت پیشِ نظر ہو کہ آج کل تو پھر بھی پوری دنیا میں بالعموم اور عالمِ اسلام میں بالخصوص مذہب کا کچھ نہ کچھ چرچا موجود ہے لیکن آج سے نصف صدی قبل تو صورتِ حال بالکل حضرتِ اکبرؔ کے اس شعر کے مطابق تھی کہ ؎

"رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں - کہ اکبرؔ نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں!"

پھر اگرچہ تحریکِ پاکستان کا اصل جذبۂ محرکہ مذہبی نہیں تھا بلکہ صرف یہ "خوف" تھا کہ ہندو مسلمانوں کے ساتھ انصاف اور برابری کا سلوک نہیں کریں گے بلکہ اپنی عددی فوقیت کے بل پر ان کے حقوق غصب کریں گے اور یہ بھی بعید نہیں کہ ان سے (شریمتی اندرا گاندھی کے الفاظ میں) اپنی ہزار سالہ شکست کا انتقام لیں ــــ لیکن چونکہ مسلم قومیت کی اساس نہ نسل پر تھی نہ زبان پر بلکہ صرف اور صرف اسلام پر تھی لہٰذا جیسے جیسے قومی تحریک نے قوت پکڑی،

مذہبی جوش و خروش بھی، کم از کم زبانی کلامی حد تک، بڑھتا چلا گیا یہاں تک کہ تقسیم ہند سے متصلاً قبل پورے برِ عظیم کا طول و عرض ان نعروں سے گونج اٹھا کہ "مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ!" اور "پاکستان کا مطلب کیا، لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ!" ــــ نتیجۃً اس جذباتی اور ہیجانی فضا میں زمینی و جغرافیائی، تہذیبی و ثقافتی اور نسلی و لسانی، الغرض جملہ 'مادّی' حقائق نگاہوں سے اوجھل ہو گئے ــــ بلکہ اگر کسی نے ان کی جانب توجہ مبذول کرانے کی کوشش کی بھی تو اسے بلا توقّف غدّار اور "ہندو کا زر خرید ایجنٹ" قرار دے دیا گیا۔

بنا بریں قیامِ پاکستان سے متصلاً قبل اور اس کے بعد بھی کچھ عرصے تک کوئی گمان بھی نہیں کر سکتا تھا کہ پاکستان میں مسلم قومیت کا جذبہ ؎ "طبیعت کوئی دم میں بھر جائے گی۔ چڑھی ہے یہ آندھی اتر جائے گی" کے مصداق اس قدر جلد سرد پڑ جائے گا اور نسلی اور لسانی عصبیتیں اتنی سُرعت سے سر اٹھا لیں گی ــــ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اگر پاکستان واقعۃً اسلام کا گہوارہ اور قائدِ اعظم کے قول کے مطابق "اسلام کے اصولِ حریّت و اخوّت و مساوات" کا نمونہ بن جاتا، اور ملّت کا قافلہ اُس سمت میں رواں ہو جاتا جس سے گاندھی جی سب سے زیادہ خائف تھے یعنی "پان اسلام ازم" یا عالمی ملّتِ اسلامی کی نشاۃِ ثانیہ، تو پاکستان میں نسلی و لسانی اور صوبائی و علاقائی عصبیتیں ہرگز پروان نہ چڑھ سکتیں۔

لیکن افسوس کہ ہم من حیث القوم آزادی کے مادّی فوائد کو سمیٹنے میں اس درجہ منہمک ہوئے کہ نہ اپنے مقصد کا دھیان رہا نہ منزل کی فکر ــــ اور ستم بالائے ستم یہ کہ پاکستان کی سول بیوروکریسی اور ملٹری لیڈرشپ نے سیاسی عمل کو مسلسل ردّ کیے رکھا۔ چنانچہ یہاں نہ کُل پاکستان بنیاد پر کوئی مضبوط سیاسی جماعت وجود میں آ سکی، نہ سیاسی روایات مستحکم ہو سکیں، نہ ہی سیاسی ادارے پروان چڑھ سکے ــــ کہ نئے رجحانات کو جمہوری و دستوری خطوط پر ڈالا جا سکتا اور نظریاتی جوش و خروش کے ٹھنڈے پڑنے سے جو 'زمینی حقائق' منظرِ عام پر آئے اور انہوں نے جن نئے مسائل کو جنم دیا انہیں خوش اسلوبی سے حل کیا جا سکتا۔
نتیجتہً پاکستان کی چالیس سالہ تاریخ 'دھماکوں' کی داستان بن کر رہ گئی!

اس سلسلے کا اوّلین اور عظیم ترین دھماکہ مشرقی پاکستان میں ہوا اور وہاں ایک لسانی

عصبیت نے باضابطہ "قومیت" کی شکل اختیار کر کے نہ صرف یہ کہ پاکستان کو دولخت کر دیا بلکہ مشرقی پاکستان کو "بنگلہ دیش" میں تبدیل کر کے گویا "مسلم قومیت" کی علی الاعلان نفی کر دی۔ اس ضمن میں یہ حقیقت پیشِ نظر رہنی ضروری ہے کہ مشرقی پاکستان میں زبان کا مسئلہ قیام پاکستان کے فوراً بعد قائداعظم مرحوم کی زندگی ہی میں اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس میں ایک تو تعجب اور عبرت کا سامان ہے کہ ع "کجا آں شورا شوری، کجا ایں بے نمکی!" کے مصداق کہاں تو مسلم بنگال میں مسلم قومیت کے جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ ۱۹۴۶ء میں وہاں کی مسلم لیگی قیادت نے اصرار کر کے ۱۹۴۰ء کی قرار دادِ پاکستان میں ترمیم کرائی اور مجوّزہ پاکستان کے لئے "ریاستوں" کی بجائے "ریاست" کا لفظ طے کرایا ــــــ کجا یہ حال کہ ۱۹۴۸ء ہی میں زبان کا مسئلہ اُٹھ کھڑا ہوا جس کے لئے خود قائد اعظم مرحوم کو اپنی حقیقی اور علالت کے باوجود بنفسِ نفیس مشرقی پاکستان کا سفر کرنا پڑا۔ اور دوسرے یہ سبق مضمر ہے کہ زمینی حقائق کو نظر انداز کرنے اور حقیقی و واقعی مسائل سے مسلسل صرفِ نظر کرنے کے نتائج بہت خوفناک ہو سکتے ہیں ــــ اس لئے کہ قدرت نے ہمیں ۱۹۴۸ء سے ۱۹۷۱ء تک لگ بھگ ربع صدی کی مہلت دی لیکن ہم نے مسائل کو حل کرنے کی کوئی کوشش نہ کی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک انتہائی رسوا کن شکست اور عبرت ناک ہزیمت کا کلنک کا ٹیکہ نہ صرف ہماری بلکہ پوری عالمی ملّتِ اسلامیہ کی پیشانی پر لگ گیا۔

مغربی پاکستان کے صوبۂ سندھ میں بھی زبان کے مسئلہ پر بے چینی کے آثار قیام پاکستان کے فوراً بعد ظاہر ہو گئے تھے۔ اور یہاں بھی لسانی عصبیت کی آگ اندر ہی اندر سلگنی شروع ہو گئی تھی لیکن افسوس کہ اس کے ضمن میں بھی ہم تغافل ہی کی روش پر قائم رہے۔ مشرقی پاکستان کے ضمن میں تو یہ عذر بھی پیش کیا جا سکتا تھا کہ وہ ہم سے دور تھا اور ذرائع آمد و رفت نہ اتنے آسان تھے نہ اتنے سستے کہ عام لوگ اِدھر اُدھر آ جا سکتے اور ایک دوسرے کے حالات سے واقفیت حاصل کی جا سکتی لیکن سندھ تو ناک تلے کا معاملہ تھا۔ اس کے ضمن میں تو ہم اپنی اجتماعی بے بصیرتی کے سوا اور کسی چیز کو موردِ الزام نہیں ٹھہرا سکتے کہ سندھی نیشنلزم کی آگ اندر ہی اندر پھیلتی رہی اور اس کا دائرہ اثر و نفوذ تیزی سے بڑھتا رہا اور پوری قوم بحر "تم سنوارا کرو

بیٹھے ہوئے گیسو اپنا ! " کی تصویر بنی رہی۔

لیکن ؎ " فطرت لہو ترنگ سے ہے غافل، نہ جل ترنگ ! " کے مصداق قدرت کا قانون تو خاموش تماشائی نہیں بنا بیٹھا رہ سکتا تھا ـــــ اور نیوٹن کے بیان کردہ قوانینِ حرکت کے مطابق " ہر عمل کا ایک ردِّ عمل ہوتا ہے جو قوت و شدت میں اس عمل کے مساوی لیکن سمت اور رُخ کے اعتبار سے متضاد ہوتا ہے ! " ـــــ چنانچہ جیسے جیسے سندھ میں سندھی نیشنلزم نے زور پکڑا، سندھ میں آباد جملہ غیر سندھی لوگوں میں بالعموم اور اردو بولنے والے 'مہاجرین' میں بالخصوص ردِّ عمل کا ظہور بھی شروع ہو گیا۔ جو ابتداءً صرف ایک موہوم سی بے چینی اور بے اطمینانی کی صورت میں تھا۔ پھر اس میں مایوسی اور خوف کے منفی احساسات پیدا ہوئے، جن کا عملی ظہور متعدد مراحل سے گزر کر اور " طبقًا عَنْ طَبَقٍ " ترقی کرتا ہوا آج اتنی خوفناک اور مہیب صورت اختیار کر چکا ہے کہ علامہ اقبال کے اس شعر کے مصداق کہ ؎

" اس کی بربادی پہ آج آمادہ ہے وہ کارساز!!

جس نے اس کا نام رکھا تھا جہانِ کاف و نون ! "

بالکل ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے پاکستان کی سالمیت پر آخری اور سب سے کاری ضرب لگانے کے لیئے ان ہی لوگوں کی نوجوان نسل نے کمر کس لی ہے جو اس عالمِ اسباب میں اس کے قیام کے کریڈٹ کے سب سے بڑے دعویدار تھے ؎ " کہ ہم نے انقلابِ چرخِ گرداں یوں بھی دیکھے ہیں ! "

پہلا مرحلہ: بیرون ملک فرار

اس ردِّ عمل کے پہلے مرحلے کو غیر شعوری پسپائی یا خاموش فرار یا بائبل کی اصطلاح میں " خروج " (EXODUS) سے تعبیر کیا جا سکتا ہے یعنی جب اولاً پاکستان کا دارالخلافہ کراچی سے اسلام آباد منتقل کیا گیا ـــــ اور ثانیاً مہاجرین کی نوجوان نسل کے کانوں میں

" فرزندانِ زمین " (SONS OF THE SOIL) ۔کے قبیل کے الفاظ بار بار پڑھنے لگے اور انہوں نے محسوس کیا کہ خود وہ اس زمرے سے خارج ہیں ۔مزید برآں ' یہ صدا بھی پیہم سنائی دینے لگی کہ " پاکستان میں چار قومیتیں آباد ہیں : پنجابی ' سندھی ' پٹھان' اور بلوچ " اور اس فہرست میں بھی انہیں اپنا کوئی ذکر نہیں ملا تو انہیں بالکل اس کیفیت کا سا احساس ہونے لگا جو حضرتِ مسیح کے ان الفاظ میں جھلکتی ہے کہ "پرندوں کے لئے گھونسلے ہیں' اور جانوروں کے لئے بھٹ 'لیکن ابنِ آدم کے لئے سر چھپانے کی کوئی جگہ نہیں ہے!" اور انہیں شدت کے ساتھ محسوس ہوا کہ وہ پاکستان کی سرزمین میں 'ناپسندیدہ عنصر' نہیں تو کم از کم 'بن بلائے مہمان' کی حیثیت ضرور رکھتے ہیں اور پاکستان فی الواقع ان کا وطن نہیں ہے! ــــــ اور ان زبانی کلامی باتوں پر مستزاد جب سرکاری ملازمتوں اور تعلیمی اداروں میں داخلے کے ضمن میں 'کوٹہ سسٹم' اور دیہی اور شہری کی تقسیم نے ان پر بالفعل معیشت کا دائرہ تنگ اور ترقی کی راہیں مسدود کرنی شروع کر دیں تو مہاجرین کی نئی نسل نے پاکستان میں اپنے مستقبل سے مایوس ہو کر باہر کا رُخ کیا اور اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ایک بہت بڑی تعداد نے وطن کو خیرباد کہہ کر دیارِ غیر میں جا ڈیرہ لگایا۔ چنانچہ اب خصوصاً کراچی میں ایک بڑی تعداد ایسے مہاجر خاندانوں کی ہے جن کی پوری نوجوان نسل ملک سے باہر جا چکی ہے اور یورپ اور امریکہ کے مختلف ممالک میں مستقل سکونت اختیار کر چکی ہے۔ یہاں تک کہ کراچی میں بہت سے بڑے بڑے مکانوں اور عالیشان کوٹھیوں میں اب صرف بوڑھے والدین رہتے ہیں یا' جب وہ بھی کسی بیٹے یا بیٹی کے پاس گئے ہوتے ہیں تو' صرف مالی اور چوکیدار!

ہو سکتا ہے کہ بعض لوگوں کے سامنے اس معاملے کا یہ روشن پہلو ہو کہ ان باہر جانیوالوں کے ارسال کردہ زرِ مبادلہ سے ملکی معیشت کو سہارا ملا اور اس طرح ملک و ملت کو فائدہ پہنچا لیکن اگر ذرا دقتِ نظر سے جائزہ لیا جائے تو صاف نظر آ جائے گا کہ اس میں ایک بہت بڑا مغالطہ مضمر ہے ــــ اس لئے کہ اوّل تو یہ زرِ مبادلہ اُن اعلیٰ تعلیمیافتہ لوگوں کے ذریعے آیا ہی نہیں جو مختلف مغربی ممالک کی شہریت اختیار کر کے وہاں مستقلاً آباد (SETTLE) ہو گئے ہیں بلکہ اس کا اکثر و بیشتر حصّہ ان مزدوروں اور کاریگروں کی محنت و مشقت کا حاصل

ہے جو خالص عارضی طور پر باہر گئے ہیں یہی وجہ ہے کہ اپنے خون پسینے کی کمائی وطن بھیج رہے ہیں تاکہ واپسی پر بہتر زندگی گذار سکیں ـــــــ ثانیاً اگر اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کی ملک بدری سے کوئی مالی فائدہ ہوا ہو تب بھی علاّمہ اقبال کے اس شعر کے مصداق کہ ؎

"دیں ہاتھ سے دیکر اگر آزاد ہو ملّت ! ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارا!"

یہ بڑے گھاٹے اور خسارے کا سودا ہے۔ اس لئے کہ اس تلخ ترین حقیقت سے قطع نظر کہ دیارِ مغرب میں مستقل طور پر آباد ہونے والوں کی آئندہ نسل کی عظیم اکثریت کے بارے میں شدید خطرہ ہے کہ وہ اپنے دین و مذہب ہی نہیں، اپنی ثقافت و معاشرت حتّٰی کہ ملّی غیرت و حمیت سے محروم ہو کر مغرب کی بے خدا تہذیب اور مادر پدر آزاد معاشرت میں گم ہو جائے گی، خود پاکستان کے مستقبل کے اعتبار سے قابلیت و مہارت کا یہ نقصان (TALENT LOSS) اور ذہانت و فطانت سے یہ محرومی (BRAIN DRAIN) مُضِر ہی نہیں مہلک ہے! اور کم از کم ان سطور کے راقم کو تو اس صورتِ حال میں بھی "قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند!" کی سی کیفیت کا احساس ہوتا ہے! ـــــــ اور جب ذاتی احساس کی بات آ ہی گئی تو یہ عرض کرنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ راقم کے لئے اس معاملے کا سب سے زیادہ دردناک اور تکلیف دِہ پہلو یہ ہے کہ پاکستان سے مستقلاً باہر چلے جانے والے ان تعلیم یافتہ لوگوں میں ایک کثیر تعداد اُن کی بھی ہے جو اپنی جوانی کے دَور میں مختلف دینی تحریکوں کے زیرِ اثر آنے کے باعث اِحیائے دین و ملّت کے جذبے سے سرشار ہو گئے تھے۔ اور اگر یہ پوری قوّت ملک میں موجود رہتی تو کم از کم بظاہرِ احوال یہی نظر آتا ہے کہ پاکستان کی سماجی، سیاسی اور معاشی تعمیر بھی زیادہ مستحکم بنیادوں پر ہوتی اور یہاں اسلامی انقلاب کے امکانات بھی کہیں زیادہ روشن ہوتے ـــــــ واللہ اعلم!

اس ضمن میں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ اگرچہ غیر ممالک میں مستقلاً آباد ہو جانے والے اعلیٰ تعلیم یافتہ پاکستانیوں میں مہاجرین کے ساتھ ساتھ ایک بڑی تعداد پنجابیوں اور نسبتاً قلیل مقدار پٹھانوں کی بھی ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ملک و ملّت کی تعمیر و ترقی اور قوم کی عمومی خوشحالی اور عوامی بہبود کے نقطۂ نظر سے ان سب ہی کی صلاحیتوں سے محرومی

عظیم زیاں کاری ہے ـــــــ لیکن مہاجرین کا معاملہ کئی اعتبارات سے مختلف بھی ہے اور اہم تر بھی! مثلاً ایک اس اعتبار سے کہ ان کی نوجوان اعلیٰ تعلیم یافتہ نسل کا یہ 'خروج' بہت بڑے پیمانے (MASS SCALE) پر ہوا ـــــــ دوسرے یہ کہ ان کی اکثریت کی وطن سے ہجرت کا اصل سبب بھی "ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں!" کے مصداق اعلیٰ سے اعلیٰ ترکی تلاش نہیں تھا بلکہ یہ تھا کہ وطن میں اپنا مستقبل انہیں بالکل ہی تاریک نظر آرہا تھا ـــــــ اور آخری لیکن اہم ترین بات یہ کہ چونکہ وہ خود یا اُن کے والدین بھارت سے ہجرت کرکے پاکستان آئے تھے لہٰذا ان میں خواہ شعوری سطح پر دین کے فہم و ادراک میں کمی رہی ہو، اور عملی سطح پر ٹھیٹھ دینی اخلاق و کردار بھی وافر مقدار میں موجود نہ ہوں، کم از کم جذبۂ ملّی بدرجۂ اتم موجود تھا اور امّتِ مسلمہ کی عظمت و سطوتِ گذشتہ کی بازیافت کی شدید خواہش بہرحال موجود تھی ـــــــ اور آج پاکستان کے استحکام ہی نہیں، وجود و بقا تک کو سب سے بڑا خطرہ اسی جذبے اور آرزو کے فقدان سے لاحق ہے! ـــــــ اور اگر دل کے کان بند نہ ہوں تو ہر حساس و مخلص پاکستانی مسلمان کو جذبۂ ملّی سے سرشار اور ملّتِ اسلامی کی نشاۃ ثانیہ کی آرزومند اس نوجوان قوت کے وطن سے فرار پر علّامہ اقبال کی رُوح یہ فریاد کرتی سُنائی دے گی کہ ؎

"آئے عشّاق، گئے وعدۂ فردا لے کر ڈھونڈ اب ان کو چراغِ رُخِ زیبا لے کر!"

اور ؎ میں کہ میری نوا میں ہے آتشِ رفتہ کا سُراغ میری تمام سرگذشت کھوئے ہوؤں کی جستجو!"

دوسرا مرحلہ: پنجابیوں اور پٹھانوں کے ساتھ دفاعی اتحاد

ملک سے باہر چلے جانے والوں کا معاملہ جذباتی اور نفسیاتی نقطۂ نظر اور ملک و ملّت کے مستقبل کے اعتبار سے نہایت اہم ہونے کے باوجود، ظاہر ہے کہ 'مقدار اور کمیّت' کے اعتبار سے اتنا مؤثر نہیں تھا کہ اندرون ملک ردِّ عمل کی مزید پیش رفت کے لئے رکاوٹ بن سکتا۔ اس لئے کہ اوّل تو باہر جانے والے صرف اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ تھے، نسبتاً کم تر

علمی صلاحیتوں کے حامل لوگوں کے لئے باہر کا راستہ بہت بعد میں کھلا (اور وہ بھی امریکہ وغیرہ میں نہیں بلکہ اکثر و بیشتر صرف سعودی عرب اور خلیج کی ریاستوں میں، جہاں کا معاملہ خالص عارضی ہے!) ـــــ پھر جیسے جیسے وقت گذرا یورپ اور امریکہ وغیرہ کی ضروریات بھی پوری ہوتی چلی گئیں اور اس طرح گویا دنیا کی "انسانی منڈیوں" میں "مانگ" کم ہوتی گئی اور بیرونِ ملک امکانات بھی روشن نہ رہے تو ملک کے اندر رہتے ہوئے اپنے مستقبل کے تحفظ کی فکر لاحق ہوئی ـــــ اور اس طرح عملی جوابی کارروائی کا آغاز ہوا، جسے اس ردِ عمل کا دوسرا مرحلہ قرار دیا جا سکتا ہے!

اس سلسلے میں پہلے قدم کے طور پر مسٹر جی ایم سید کے قائم کردہ "سندھ متحدہ محاذ" کے مقابلے میں "سندھ کراچی مہاجر پنجابی پٹھان متحدہ محاذ" کا قیام عمل میں آیا جس کے بانی و مؤسس اور روحِ رواں نواب مظفر حسین خاں مرحوم تھے۔ جس نے پہلی بار کھلے الفاظ میں سندھی نیشنلزم کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے آگے بند باندھنے اور سندھ میں آباد دوسری قومیتوں کے حقوق کے تحفظ کی بات کی۔ یہ محاذ اوائل اکتوبر ۱۹۶۹ء میں حیدرآباد سندھ میں منعقدہ کنونشن میں قائم ہوا جس میں یہ طے کیا گیا کہ "محاذ کی رکنیت ہر اس بالغ مرد اور عورت کو دی جائے گی جسے مسٹر جی ایم سید کے جدید فلسفۂ قومیت کے اصول پر غیر سندھی یا نیا سندھی پکارا جاتا ہے" ـــــ روزنامہ نوائے وقت کے سیاسی مبصر جناب محمد علی کے مضمون کے مطابق:

"کنونشن کے ابتدائی اجلاس میں جو قراردادیں منظور کی گئیں تھیں ان میں کہا گیا تھا کہ ان اعلیٰ افسران کے خلاف سخت تادیبی کارروائی کی جائے جو نظریۂ پاکستان اور اسلام سے انحراف کر کے تعصب اور عصبیت کی بنیاد پر کاروبارِ زندگی چلا رہے ہیں۔ بھارت میں فسادات سے متاثرہ افراد کے لئے پاکستانی سرحد کھولی جائے اور بھارتی حکومت کے مسلمان دشمن طرزِ عمل کی مذمت کی جائے۔ صوبائی و لسانی تعصب کا خاتمہ کیا جائے۔ سندھ کے آبادکاروں کی زبردستی بے دخلی روکی جائے۔ پنجابی آبادکاروں کو قانون کا تحفظ فراہم کیا جائے ان ہندوؤں کے خلاف سخت کارروائی کی جائے جو تقسیم کے وقت

بھارت چلے گئے تھے۔ لیکن اب واپس آ کر مسلمانوں کی املاک پر قبضہ کر رہے ہیں۔ کوٹہ
سسٹم ختم کیا جائے۔ فنی تعلیمی اداروں میں اہلیت و قابلیت کے اصول پر عمل کیا جائے۔
مارشل لاء ریگولیشن ۸۹،۸۴، ۹۱ کی تنسیخ کی جائے۔'

نتیجہ: خونی تصادم

اندرونِ سندھ اس وقت تک جو فضا تیار ہو چکی تھی اس کے پیشِ نظر یہ بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ قدیم سندھیوں نے اس محاذ کے قیام اور اس کی مندرجہ بالا قرار دادوں کو اپنے خلاف ' اعلانِ جنگ ' سمجھا اور اس طرح جو آگ اب تک اندر ہی اندر سُلگ رہی تھی اُس کے بھڑک اُٹھنے اور منظرِ عام پر آجانے کا وقت آگیا۔ چنانچہ اوّلاً ۲۶ر جنوری ۷۰ء ہی کو (گویا محاذ کے قیام کے چار پانچ ماہ کے اندر اندر) حیدر آباد میں مہاجر اور سندھی طلبہ کے مابین خون ریز تصادم ہوا اور اس کے کُل دو ہی سال بعد ۱۹۷۲ء میں سندھ کے طول و عرض میں ' لسانی فسادات ' کا دھماکہ ہوگیا۔

۷۲ء کے ان لسانی فسادات کی وسعت اور تیزی و تُندی سے قطع نظر اوّلاً یہ بات بہت معنی خیز ہے کہ یہ ۷۱ء کے سقوطِ مشرقی پاکستان کے حادثۂ فاجعہ کے فوراً بعد ہوئے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان دونوں رُوح فرسا واقعات کا تعلق کسی ایک ہی بین الاقوامی سازش سے تھا ـــــ ثانیاً اس بظاہر خالص اندرونی معاملے اور داخلی مسئلے کے ڈانڈے کس طرح سندھی ہندوؤں کی وساطت سے بھارت کے ساتھ ملے ہوئے تھے اس کا اندازہ ان الفاظ سے کیا جاسکتا ہے جو "لڑ" نکل جاتی ہے جس کے منہ سے سچی بات مستی میں" کے مصداق مشرقی پاکستان کی ' فتح ' کے نشے میں بدمست ہونے کے باعث آنجہانی اندرا گاندھی کی زبان سے اپنی قوم کو خطاب کرتے ہوئے نکل گئے تھے کہ "میں بہت جلد آپ لوگوں کو ایک اور بہت بڑی خوشخبری بھی سنانے والی ہوں!" ـــــ یہ دوسری بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت و مشیّت میں ابھی ہمارے لئے مزید مہلت مقدّر تھی اور عذاب کے یہ کوڑے دراصل اس سُنّتِ الٰہی کا مظہر تھے جو سورۂ سجدہ کی آیت ۲۱ میں

بدیں الفاظ وارد ہوئی ہے ــــ " وَلَنُذِيقَنَّهُمْ مِنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ○ " یعنی " ہم انہیں اپنے آخری اور بڑے عذاب سے پہلے چھوٹے عذاب کا مزہ چکھائیں گے، شاید کہ یہ اپنی روش سے باز آجائیں " ــــ لہٰذا ملک وملّت کے دشمنوں کی دلی آرزوئیں پوری نہ ہوسکیں اور پاکستان کا نام صفحۂ ہستی سے بالکلیہ نہ مٹایا جاسکا!

واضح رہے کہ ارادۂ خداوندی سے قطعِ نظر، عالمِ اسباب میں اس کے تین نمایاں سبب تھے: ایک یہ کہ امریکہ میں اس وقت عارضی طور پر صدر نکسن برسرِ اقتدار تھے جن کے پاکستان کی جانب جھکاؤ (PRO-PAKISTAN TILT) کا آنجہانی اندرا گاندھی کو عمر بھر گلہ رہا۔ دوسرے یہ کہ پاکستان میں اس وقت مرحوم ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت قائم تھی جو خود تو سندھی تھے مگر انہیں سیاسی تائید (SUPPORT) سندھ سے بھی کہیں زیادہ پنجاب سے حاصل تھی اور اس طرح ان کی شخصیت کو اس وقت مغربی پاکستان کے ان دو سب سے بڑے صوبوں کے مابین رابطے (LINK) کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی اور تیسرے یہ کہ سندھی نیشنلزم کے انتہاپسند علمبرداروں سے اس موقع پر ایک اہم غلطی یہ سرزد ہوگئی کہ انہوں نے مہاجروں اور پنجابیوں دونوں کے خلاف اپنی نفرت وعداوت کا اظہار بیک وقت کر دیا اور سندھی انتہا پسندی ابھی اتنی مضبوط اور توانا نہ تھی کہ بیک وقت دونوں محاذوں پر مقابلہ کرسکتی!

بھٹو دور کی نظریاتی محاذ آرائی

اس وقت، ظاہر ہے کہ، نہ مسٹر بھٹو کے ذاتی محاسن ومعائب کا جائزہ لینا پیشِ نظر ہے، نہ ان کے پانچ سالہ دورِ حکومت کا تفصیلی میزانیۂ نفع ونقصان مرتب کرنا مطلوب ہے، البتہ موضوعِ زیرِ بحث کے اعتبار سے اِس حقیقت کی جانب اشارہ ضروری ہے کہ اس دَور کے آغاز واختتام، دونوں مواقع پر ملک میں نظریاتی تقسیم اور اُس سے پیدا شدہ اُفقی محاذ آرائی (HORIZONTAL PULARISATION) اتنی شدّت کے ساتھ پیدا ہوئی کہ اُس کے نتیجے

میں علاقائی اور نسلی و لسانی اختلافات اور اُن سے پیدا ہونے والی عمودی تقسیم ——— (VERTICAL POLARISATION) کسی قدر پس منظر میں چلی گئی۔ چنانچہ اس دَور کا آغاز بھی دائیں اور بائیں بازو کے پُرزور تصادم اور ' اسلام ' اور ' سوشلزم ' کے مابین دھواں دھار جنگ سے ہوا تھا (اگرچہ اس تصادم اور جنگ کی حیثیت زیادہ تر صرف کاغذی اور ہوائی تھی!) اور اس کا اختتام بھی پاکستان قومی اتحاد (P.N.A.) کی اس تحریک کے ذریعے ہوا جو اگرچہ ابتداء میں تو خالص سیاسی نوعیت کی تھی لیکن بعد میں رفتہ رفتہ تحریک نظامِ مصطفےٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی صورت اختیار کر گئی۔ چنانچہ اس میں ہرگز کوئی شک نہیں کہ اس کے دَوران تحریکِ پاکستان کے آخری اور فیصلہ کُن ایّام کی کیفیات عود کر آئی تھیں اور صرف قومی و ملّی ہی نہیں، دینی اور مذہبی جوش و خروش بھی ایک بار پھر نقطۂ عروج کو پہنچ گیا تھا۔ اس کے نتیجے میں علاقائی اور لسانی عصبیتوں کا معاملہ لامحالہ پس منظر میں چلا گیا ' یہاں تک کہ بالکل ایسے جیسے تحریکِ خلافت کے عروج کے دوران گاندھی ایسے ہندو ' مہاتما ' کو اس میں شمولیت اختیار کرنی پڑی تھی ' سندھی نیشنلزم کے ' گورو ' یعنی مسٹر جی ایم سیّد کو بھی ' خواہ دبی زبان ہی سے سہی ' پاکستان قومی اتحاد کی تحریک کی تائید کرنی پڑی۔

اس نظریاتی تصادم کے اثرات کے علاوہ چونکہ بھٹو دَور میں پاکستان میں ایک طویل عرصے کے بعد پہلی مرتبہ ' عوامی سیاست ' کی گہما گہمی پیدا ہوئی تھی اور عوام میں خواہ صحیح خواہ غلط ' یہ احساس ضرور پیدا ہوا تھا کہ اب ہمارے معاملات ہمارے اپنے ہاتھوں میں ہیں (اور یہ احساس بجائے خود بہت تسکین بخش ہوتا ہے!) لہٰذا اس دَور میں سیاسی محرومی کے اس عمومی احساس میں بھی کمی پیدا ہوئی جسے سندھ میں خصوصی شدّت کے ساتھ محسوس کیا گیا تھا ——— اور ان سب پر ' مستزاد ' اس واقعے نے بھی سندھ کے خصوصی احساسِ محرومی میں بہت کمی کر دی تھی ' بلکہ اہلِ سندھ کے زخموں پر مرہم کا کام کیا تھا ' کہ اب پاکستان کی مرکزی حکومت کے سنگھاسن پر ایک سندھی براجمان ہے!

ان جُملہ عوامل کے باوجود اس دَور میں بھی سندھی نیشنلزم کا جذبہ بالکل سرد نہیں

پڑا تھا بلکہ بقول "آگ بجھی ہوئی نہ جان، آگ دبی ہوئی سمجھ!" کے مصداق اُس نے دوبارہ صرف اندر ہی اندر سلگنے والی آگ کی صورت اختیار کر لی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ خود بھٹو صاحب کو سندھی نوجوانوں کی جذباتی کیفیت کے پیشِ نظر "کوٹہ سسٹم" کو دس سال تک کے لئے دستوری تحفظ فراہم کرنا پڑا۔ مزید برآں ـــــ کُل پاکستان سطح پر "قائدِ عوام" کی حیثیت تو صرف ذوالفقار علی بھٹو کو حاصل ہوئی تھی، اُن کے دوسرے سندھی رفقاء اور اعزّہ واقارب کو تو بہرحال اپنی سیاست کی بساط سندھ ہی کی اساس پر بچھانی تھی۔ لہٰذا انہوں نے بھی درپردہ سندھی نیشنلزم کی حمایت کی۔ چنانچہ اس دَور میں بھی انتہا پسند سندھی قوم پرستی کا لاوا اندر ہی اندر کھولتا رہا اور اس کی سوزش اور جلن جملہ "نئے سندھیوں" اور خاص طور پر اردو بولنے والے مہاجرین کی نوجوان نسل کو محسوس ہوتی رہی۔ نتیجۃً جوابی ردِّ عمل کا مواد بھی اندر ہی اندر پکتا رہا ـــــ اور کون کہہ سکتا ہے کہ ۱۹۷۷ء کے عام انتخابات میں دھاندلی کے خلاف جو "دھماکہ خیز" تحریک سندھ کے تمام شہروں اور خاص طور پر کراچی میں شروع ہوئی تھی اس کے اسباب وعوامل میں "نئے سندھیوں" اور خصوصاً ان کی نوجوان نسل کے اس ردِّ عمل کو فیصلہ کُن دخل حاصل نہ تھا!

جنرل ضیاء الحق کا دَورِ حکومت
اور موجودہ صورتحال

جنرل محمد ضیاء الحق بالقابہ کا نو سالہ دورِ حکومت اِس داستان کا المناک ترین باب ہے، چنانچہ اِس عرصے کے دوران وہ جملہ کیفیات جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اپنے آخری نقطۂ عروج کو پہنچ گئیں۔

اِس عہد کے ابتدائی پانچ سالوں کے دوران ــــــ ایک طرف تو مارشل لاء کے نفسیاتی رعب کی وجہ سے ملک میں جیل کے "سب اچھا" کا سا سماں بندھا رہا، اور ــــ دوسری طرف کچھ نفاذِ شریعت کے دعووں اور شرعی عدالتوں کے قیام، کچھ مذہبی تقریبات کی رونق افروزی اور رویتِ ہلال کے شاندار اہتمام اور کچھ علماء کرام کی خاطر مدارات اور مشائخ عظام کے اعزاز و اکرام کی وجہ سے فضا پر مذہبیت کا ظاہری اور سطحی رنگ قائم رہا، مزید برآں جشن استقلال اور یوم اقبال کے قبیل کی 'قومی تقریبات' پر پانی کی طرح پیسہ بہانے سے 'پاکستانیت' کا بھی چرچا رہا ــــــ اور اس طرح مجموعی طور پر یہ تأثر قائم کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی کہ اسلام اور نظریۂ پاکستان کی جانب فیصلہ کن مراجعت ہو رہی ہے اور ان کے منافی رجحانات رفتہ رفتہ ختم ہو رہے ہیں!

لیکن افسوس کہ حقیقت اس کے بالکل برعکس تھی اور حضرت اکبرؔ کے اِس شعر کے مصداق کہ ؎

"مذہب کی لیپ پوت سے دبتی نہیں ہے عقل　　　بس عشق ہی مٹاتا ہے اِسکی کریدکو!"

اِس ظاہری ٹیپ ٹاپ کے پردے میں زیرِ سطح رجحانات (UNDER-CURRENTS) مسلسل قوت پکڑتے اور شدّت اختیار کرتے چلے گئے۔ جن میں دو اگرچہ ملک گیر تھے۔ لیکن ان کی شدّت کا سب سے زیادہ ظہور سندھ میں ہوا اور تیسرا تو تھا ہی خالصتہً (EXCLUSIVELY) سندھ سے متعلق۔

تین منفی نتائج

(۱) مقدّم الذکر ملک گیر اثرات میں سے پہلا یہ کہ مارشل لار کے نفاذ سے فطری اور منطقی طور پر سیاسی محرومی کا اِحساس دوبارہ شدّت کے ساتھ پیدا ہو گیا اور اس بار چونکہ فوری تقابل بہت نمایاں تھا کہ کہاں بھٹو دَور کی عوامی سیاست کی گہما گہمی اور کہاں مارشل لار کا قبرستان کا سا سکوت، لہٰذا اِس مرتبہ اُس کا اِحساس بھی بہت شدّت سے ہوا۔ بالخصوص سندھ میں تو اس نے غالب کے "جوہر اندیشہ" کی سی حدّت اختیار کر لی (؂ "عرض کیجیے جوہر اندیشہ کی گرمی کہاں۔ کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل اُٹھا!") اور ریگزارِ سندھ واقعتہً نفرت اور بغاوت کی آگ میں جلنے لگا! چنانچہ ایک جانب سندھی قوم پرستی تیزی کے ساتھ انتہا پسندی کی طرف بڑھنے لگی اور دوسری جانب ملک وملّت کے کھلے دشمنوں اور اغیار کے ایجنٹوں کو بھرپور موقع مل گیا کہ وہ 'پنجابی فوج' اور 'پنجابی سامراج' کے حوالے سے پنجاب اور اہلِ پنجاب کے خلاف نفرت و عداوت کی آگ کو پوری شدّت کے ساتھ بھڑکائیں —— اور سندھ کی مظلومیت اور اہلِ سندھ کے حقوق کی دہائی دے کر قدیم سندھیوں کے جذبات کو مشتعل کریں اور بھولے بھالے عوام الناس ہی نہیں ٹھیٹھ دینی مزاج کے حامل لوگوں حتّٰی کہ علمار کرام تک کو 'حقوق کی بازیافت'، کے جذبے سے سرشار کر کے بالفعل ایجی ٹیشن کے میدان میں لے آئیں!۔ اور اس جلتی آگ پر تیل ہی نہیں، پٹرول کا کام کیا مسٹر بھٹو کی پھانسی نے —— خصوصاً اس لیے کہ بدقسمتی سے سپریم کورٹ کے جس فیصلے کی رُو سے انہیں یہ سزا ملی وہ متفقہ (UNANIMOUS) نہیں تھا بلکہ کثرتِ رائے پر مبنی تھا، اور ستم بالائے ستم یہ کہ جن چار جج حضرات نے ہائی کورٹ کے فیصلے کو برقرار رکھا وہ سب پنجاب سے تعلق رکھتے تھے اور بقیہ

تین جج جنہوں نے انہیں بری کرنے کی رائے دی وہ سب غیر پنجابی تھے۔ نتیجتہً پنجاب کے خلاف اہلِ سندھ کی نفرت میں انتقامی جذبہ بھی شامل ہو گیا۔

مختصر یہ کہ اِس عرصے کے دوران رفتہ رفتہ اندرونِ سندھ بالکل وہ حالات پیدا ہو گئے جو کبھی مشرقی پاکستان میں ہوئے تھے اور جس طرح وہاں بنگالی نیشنلزم کے علمبرداروں کے مقابلے میں محبِّ وطن عناصر بے بس ہو کر رہ گئے تھے اُسی طرح سندھ میں بھی 'سندھو دیش' کے حامیوں کے مقابلے میں پاکستان کی یکجہتی اور سالمیت کے علمبردار غیر مؤثر ہوتے چلے گئے چنانچہ بعینہٖ اس طرح جیسے ایک بار مولوی فرید احمد مرحوم و مغفور کے خلاف ڈھاکہ ائرپورٹ پر ایک مظاہرے میں نعرے لگے تھے کہ "پنجابار دلّال پھیری جاؤ" یعنی "پنجابیوں کے ایجنٹ اور دلّال واپس چلے جاؤ" اُسی طرح کا نقشہ سامنے آتا ہے مس بے نظیر بھٹو کے اس حالیہ بیان میں کہ "اب سندھ میں جو بھی وفاق کی بات کرتا ہے اُسے پنجاب کا ایجنٹ قرار دے دیا جاتا ہے!" ـــــ راقم الحروف کو اس صورتِ حال کا اندازہ ۸۲ء ہی میں ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس نے دسمبر ۸۲ء میں جنرل ضیاء الحق کے نام خط میں واضح طور پر لکھ دیا تھا کہ:-

"۔۔۔۔ اِس ضمن میں اغلباً آپ کے اطمینان کا باعث یہ امر ہے کہ آپ کے خلاف کوئی عوامی تحریک تاحال نہ چل سکی ہے، نہ ہی اس کا کوئی فوری اندیشہ موجود ہے ـــــ اِس سلسلہ میں میَں یہ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ خدارا اِس صورتِ حال سے دھوکا نہ کھایئے۔ اِس لیے کہ اس کا اصل سبب بین الاقوامی حالات ہیں جن کے باعث پاکستان کے محبِّ وطن بالخصوص دینی و مذہبی مزاج کے لوگ کوئی 'RISK' لینے کو تیار نہیں ہیں ـــــ لیکن ایک تو کون نہیں جانتا کہ بین الاقوامی حالات میں کوئی بھی تبدیلی کسی بھی وقت رُونما ہو سکتی ہے اور دوسرے ملک کے بقاء و استحکام کے لیے یقیناً بین الاقوامی صورتِ حال بھی کسی قدر اہم ہوتی ہے لیکن اصل اہمیت اس ملک کے اپنے عوام کے اطمینان کی ہوتی ہے۔

اِس سلسلے میں بالخصوص اندرونِ صوبۂ سندھ جو لاوا پک رہا ہے، مجھے یقین ہے کہ اس کا علم آپ کو بھی لازماً ہوگا۔ لیکن میں اس امکان کو بھی یکسر نظرانداز نہیں کرسکتا کہ بعض اوقات صاحبِ اقتدار لوگوں کے اردگرد جن لوگوں کا حصار قائم ہوجاتا ہے وہ اُسے صحیح صورتِ حال سے مطلع نہیں ہونے دیتے۔ میرے اندازے میں سندھ میں "سندھو دیش" کے لیے میدان پُوری طرح اُسی طرح ہموار ہوچکا ہے جیسے مشرقی پاکستان میں "بنگلہ دیش" کے لیے ہوا تھا اور اب فرق صرف یہ ہے کہ چونکہ مشرقی پاکستان ہم سے دُور اور کٹا ہوا تھا، اِس لیے مرکزی حکومت وہاں مؤثر کنٹرول نہ کرسکی اور سندھ چونکہ زمینی طور پر ملحق ہے لہٰذا یہاں ایسی کسی بھی تحریک کو بآسانی کچلا جاسکتا ہے لیکن میرے نزدیک اِس عامل (FACTOR) پر بہت زیادہ انحصار بھی سخت ناعاقبت اندیشی ہے۔۔۔۔"

افسوس صد افسوس کہ راقم کے اندیشے صحیح ثابت ہوئے اور اس تحریر کے سات آٹھ ماہ کے اندر اندر ایم۔آر۔ڈی کی تحریک کے ضمن میں سندھ کا آتش فشاں پھٹ گیا اور اتنا زوردار 'دھماکہ' ہوا کہ اچھے اچھے سیاسی مدبّر و مبصّر بھی حیران رہ گئے! ——— لیکن سورۃ قیامہ کے الفاظ "اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ثُمَّ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى" کے مصداق مزید افسوس اور پھر مزید افسوس ہے اس پر کہ تاحال نہ سندھ کے اصل مرض کی تشخیص کی جانب کوئی توجہ ہے نہ اُس کے ازالے کی کوئی فکر، بلکہ کل تکیہ اور بھروسہ بالکل المیہ مشرقی پاکستان کے مانند صرف طاقت کی دلیل یا پھر ایک سُپر پاور کی موہوم تائید پر ہے۔

(۲) دوسرا المناک نتیجہ برآمد ہوا اس سے کہ اسلام اور نفاذِ اسلام کا نعرہ جس شدّ ومد اور جس بلند بانگ انداز میں لگایا گیا اُس کے مقابلے میں حقیقی اور واقعی پیش رفت کا تناسب بالکل نہ ہونے کے برابر رہا اور معاشرہ اور قوم کا حال نہ صرف یہ کہ جُوں کا توں رہا بلکہ پہلے سے بھی بدتر ہوگیا چنانچہ انفرادی اخلاق و کردار کی پستی بھی بڑھتی چلی گئی، انتظامی ابتری اور امن وامان کی زبوں حالی بھی روز افزوں ہوتی گئی۔ دجس کا نمایاں ترین مظہر یہ کہ خود "مقتدر اعلیٰ" کے قول کے مطابق

رشوت پہلے سے بھی کئی گنا بڑھ گئی) اور اس کے ساتھ ساتھ سماجی ظلم اور معاشی استحصال کی جُملہ صورتیں بھی جُوں کی توُں برقرار رہیں —— لہٰذا اسلام دشمن قوتوں کو بھرپور موقع ملا کر اسلام کو بدنام کریں اور پاکستان کی سالمیت کے خلاف ریشہ دوانیوں سے بھی آگے بڑھ کر خود 'نظریۂ پاکستان' پر کاری ضرب لگائیں۔ اسلام اور نظام اسلامی کے ساتھ تمسخر و استہزاء کے اِس سنہری موقع سے پورا فائدہ اٹھانے والوں میں غیر مسلموں، کیمونسٹوں اور مارکسسٹوں کے علاوہ وہ مغرب زدہ اور جدیدیت گزیدہ 'لبرل' مسلمان بھی شامل ہو گئے جو یا تو باضابطہ الحاد کا شکار ہو چکے ہیں یا کم از کم نظامِ اجتماعی کی حد تک لادینیت (سیکولرزم) کے قائل ہیں۔ چنانچہ اوّلاً نماز آرڈیننس کا مذاق اڑا، پھر زکوٰۃ اور حدود آرڈیننس کی مٹی پلید ہوئی، پھر نظامِ زکوٰۃ کے سیاسی مقاصد کے حصول کا ذریعہ ہونے کا چرچا ہوا، آخر میں "نظامِ صلوٰۃ" کی باری آ ہی رہی تھی کہ وہ دورانِ ولادت ہی راہیٔ ملکِ عدم ہو گیا ——
اِس سلسلے میں بھی راقم کوئی تازہ رائے یا تبصرہ پیش کرنے کی بجائے اپنے انہی احساسات کو دوبارہ ریکارڈ پر لانا زیادہ مناسب سمجھتا ہے جن کا اظہار اُس نے ۸۲ء میں صدر ضیاء الحق کے نام اپنے متذکرہ بالا خط میں کیا تھا:-

"۔۔۔۔ جہاں تک اِس ملک میں اِسلامی شعائر کی ترویج اور شریعتِ اسلامی کے نفاذ —— یا بالفاظِ دیگر 'اسلامی نظام' کے قیام کا تعلق ہے اُس کے بارے میں مجھے اِس وقت کچھ عرض نہیں کرنا جس کا اصل سبب میں معذرت کے ساتھ عرض کرتا ہوں، یہ ہے کہ اس معاملے میں مَیں آپ سے قطعاً مایوس ہو چکا ہوں اور عرض و معروض اور گلہ شکوہ وہیں ہوتا ہے جہاں کوئی توقع موجود ہو۔۔۔۔ اِس ضمن میں، جیسا کہ مَیں نے ۲۰ اگست ۸۰ء کو علماء کنونشن میں اپنی تقریر میں عرض کیا تھا، ابتدائی تین سال، جو اِس اعتبار سے نہایت قیمتی تھے کہ "تحریکِ نظامِ مصطفےٰ" کا جوش و خروش برقرار تھا اور ملکی فضا میں وہ کیفیت قائم تھی کہ نظامِ اسلامی کے نفاذ کے ضمن میں بڑے سے بڑا اقدام بھی بلا روک ٹوک کیا جا سکتا تھا، تعطّل و تربّص

کے نذر کر دیئے گئے۔
پھر جب حدود اور زکوٰۃ آرڈیننس کا اجرا ہوا اور اس پر اہلِ تشیع کی جانب سے جارحانہ ردِ عمل ظاہر ہوا تو نہ صرف یہ کہ گھٹنے ٹیک دیئے گئے بلکہ —— زیادہ قابلِ افسوس اور اہم تر بات یہ کہ نظامِ زکوٰۃ کے ضمن میں شیعہ اور سُنّی کے مابین تفریق کر کے ضعیف الایمان یا ناواقف سنیوں کے شیعہ بن جانے کا دروازہ کھول دیا گیا —— اِس کے باوجود کہ میں نے ۱۸ راگست ۸۰ء کے مشاورتی اجلاس میں خدا کا واسطہ دے کر عرض کیا تھا کہ اِس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ آپ زکوٰۃ آرڈیننس پورے کا پورا واپس لے لیں اور زکوٰۃ کی ادائیگی کو حسبِ سابق عوام کا نجی معاملہ قرار دے دیں —— لیکن خدارا اِس میں شیعہ اور سُنّی میں فرق و امتیاز نہ قائم فرمایئے گا۔
اجتماعیاتِ انسانیہ کے ذیل میں اوّلین معاملہ عائلی اور سماجی نظام کا ہے اور اِس کے ضمن میں ایک طرف عائلی قوانین کو شریعت کورٹ کے دائرۂ کار اور حدودِ اختیار میں لانے کی جرأت آپ اس لیے نہیں کر پا رہے کہ بعض اعلیٰ طبقات کی بیگمات اور کچھ مغرب زدہ خواتین کی جانب سے ناموافق ردِ عمل کا اندیشہ ہے —— اور دوسری طرف معاشرہ میں خواتین کے مقام و کردار اور ستر و حجاب یا خود آپ کے الفاظ میں "چادر اور چار دیواری" کے ضمن میں اِسلام کے نقطۂ نظر کے بارے میں جو اختلافات گذشتہ دنوں ہمارے ملک میں زور شور سے ظاہر ہوتے، اُس کے بارے میں اگرچہ زبانی تو آپ نے کچھ باتیں ایسی بھی کہیں جو دینی طبقات کے لیے اطمینان بخش تھیں لیکن عملاً اپنا پورا وزن مغرب زدہ اور اباحیت پسند طبقے میں ڈال رکھا ہے۔ (بالخصوص آپ کے حالیہ غیر ملکی دوروں کے دوران آپ کی اہلیہ صاحبہ محترمہ کا یہ طرزِ عمل کہ سَر سے چادر بھی اُتر گئی اور نامحرموں سے مصافحہ بھی ہو گیا، از خود فیصلہ کن تھا، لیکن اُس پر مزید مہرِ تصدیق آپ کے اُن فرمودات

سے ثبت ہوگئی جو آپ نے اغلباً ہوسٹن میں ارشاد فرمائے تھے)
بنابریں پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام و نفاذ کے عظیم معرکے کے آپ کے ہاتھوں سر ہونے کی اب کم از کم مجھے کوئی امید باقی نہیں رہی ــــــ اور مجھے اِس رائے تک پہنچنے میں کہ یہاں اسلام صرف انقلابی طریق کار ہی سے آسکتا ہے، آپ کے اِس جملے نے بھی مدد دی جو بلدیاتی نمائندوں کے ایک اجلاس میں ایک برقع پوش خاتون کونسلر کے تابڑ توڑ سوالات کے جواب میں، کہ آپ نفاذِ اسلام کے لیے یہ کیوں نہیں کرتے ہیں! وہ وہ کیوں نہیں کرتے ہیں؟ آپ نے ارشاد فرمایا تھا کہ "بیٹی! اس ملک میں اسلام کسی انقلابی عمل کے نتیجے میں نہیں آرہا کہ ہم اتنے بڑے بڑے قدم اٹھا سکیں!!"

نفاذِ اسلام کے دعووں اور اُس کے ضمن میں ظاہری اور سطحی، اور نیم دلانہ ہی نہیں خالص نمائشی اقدامات کا متذکرہ بالا ردِعمل جیسے کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، ملک گیر تھا۔ بلکہ جن لوگوں کو بیرونِ ملک جانے کا اتفاق ہوتا رہتا ہے اُن کے کانوں نے یہاں کے تمسخر و استہزا کی بازگشت دُور دراز کے ممالک میں بھی سُنی، لیکن اندرونِ سندھ تو یہ گویا ملحد اور بے دین لوگوں، کمیونسٹوں اور مارکسسٹوں، اور سب سے بڑھ کر روس اور بھارت کے ایجنٹوں کے لیے سنہری موقع تھا جس سے اگر وہ بھرپور فائدہ نہ اٹھاتے تو خود اپنے نظریۂ حیات سے غداری کے مرتکب ہوتے۔ نتیجہ نگاہوں کے سامنے ہے کہ آج اُن قدیم سندھی مسلمانوں کی تعلیم یافتہ نوجوان نسل کا بہت بڑا حصہ، جو خود اب بھی نہایت گہرے مذہبی مزاج کے حامل ہیں، مذہب کا نام تک سننے کو تیار نہیں، اور دین اور شعائرِ دینی سے کھلم کھلا بیزاری کا اظہار کر رہا ہے۔

(۳) مارشل لاء کے تسلسل کا تیسرا نتیجہ جو صوبہ سندھ کے ساتھ خاص تھا یہ نکلا کہ اِس عرصے کے دوران مہاجرین اور خصوصاً ان کی نوجوان نسل کے ردِعمل میں مزید شدت پیدا ہوتی۔ یہاں تک کہ اُن کی جوابی کارروائی میں "تنگ آمد بجنگ آمد" کے مطابق جارحانہ انداز بھی پیدا ہو گیا۔ اِس کا سبب یہ ہوا کہ ایک تو اِس دَور میں بھی کوٹہ سسٹم اور دیہی اور شہری کی تقسیم جُوں کی تُوں برقرار رہی۔ دوسرے مارشل لاء نے اپنے براہِ راست

عمل دخل کو، بالخصوص صوبۂ سندھ میں، لاء اینڈ آرڈر اور امن وامان کے زیادہ بڑے اور اہم معاملات تک محدود رکھا اور نسبتاً چھوٹے اور بظاہر غیر اہم واقعات کے ضمن میں صرف نظر ہی نہیں غضِ بصر سے کام لیا۔ لہٰذا انتہا پسند سندھی قوم پرستوں کو کھلی چھٹی مل گئی کہ وہ غیر سندھی نوجوانوں پر تعلیم اور معیشت کا دائرہ تنگ سے تنگ تر کرتے چلے جائیں ـــــــ اور نوبت بایں جا رسید کہ لاڑکانہ اور نواب شاہ کے کالجوں میں پنجابی اور مہاجر طلبہ کے داخلے کے فارم پھاڑ ڈالے گئے اور انہیں زدوکوب کر کے بھاگ جانے پر مجبور کر دیا گیا۔ اور لطف یہ کہ یہ سب کچھ مارشل لاء انتظامیہ کی عین ناک تلے ہوتا رہا۔ اس عدم تحفظ کے احساس سے جو مایوسی اور دل شکستگی پیدا ہوئی تھی اب اس میں غصّے اور جھنجھلاہٹ کا عنصر بھی شامل ہو گیا اور وہ مرنے مارنے پر تُل گئے! ـــــــ چنانچہ اس وقت راقم الحروف کو مہاجر نوجوانوں میں بالکل اُن کیفیات کا مشاہدہ ہو رہا ہے جن کا اظہار بھارت کے بعض مسلمانوں نے ۱۹۸۰ء میں تقسیم ہند کے بعد راقم کے پہلے سفرِ بھارت کے موقع پر کیا تھا۔ جو اُن ہی کے الفاظ میں یہ ہے کہ: "۱۹۷۱ء تک ہمارا یہ خیال تھا کہ ہمارا محافظ پاکستان ہے، لیکن اُس کے بعد سے ہمارا احساس یہ ہے کہ پاکستان تو اب اپنی حفاظت ہی کر لے تو بڑی بات ہے، ہمیں تو اب بھارت میں خود اپنے زورِ بازو کے بل پر جینا ہے اور اپنی حفاظت آپ کرنی ہے، لہٰذا ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ آئندہ بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح نہیں ہوں گے بلکہ مرنا ہی ہوا تو مار کر مریں گے"! ـــــــ چنانچہ سندھ میں آباد اردو بولنے والے مہاجرین کی نوجوان نسل کے بھی کچھ ایسے ہی احساسات اور جذبات ہیں جن کی کوکھ سے پہلے تو جنم لیا بعض مہاجر طلباء تنظیموں اور "نیو سندھی کلچرل ایسوسی ایشنوں" نے جو نسبتاً دھیمی بھی تھیں اور دفاعی انداز کی حامل بھی ـــــــ اور بعدازاں ان ہی احساسات وجذبات کی کوکھ سے برآمد ہوئیں "مہاجر اتحاد تحریک" (M.I.T.) اور "مہاجر قومی موومنٹ" (M.Q.M.) ایسی فعال ومتحرک بلکہ طوفانی انداز کی حامل تحریکیں جن کا اثر ونفوذ دیکھتے ہی دیکھتے جنگل کی آگ کی طرح پھیل گیا۔

اب تک کے بچاؤ کے دو اسباب

مارشل لاء کے تسلسل کے تین متذکرہ بالا تاریخ کا مجموعی حاصل تو فطری اور منطقی اعتبار سے یہ ہونا چاہیئے تھا کہ سندھ میں ۷۲ء کی تاریخ بار بار دہرائی جاتی اور لسانی فسادات آئے دن ہوتے رہتے لیکن دو اسباب کی بنا پر، جن میں سے ایک کو مثبت قرار دیا جا سکتا ہے اور دوسرے کو منفی، ایسا نہیں ہوا ——— اور سندھی نیشنلزم کی آگ اندر ہی اندر تو سلگتی بھی رہی اور پھیلتی بھی چلی گئی لیکن، الحمدللہ کہ ۷۲ء کے بعد سے آج تک سندھ میں نہ کوئی نمایاں سندھی مہاجر تصادم ہوا نہ سندھی پنجابی۔ تو آیئے کہ اب ذرا اُن اسباب کا جائزہ لے لیں!

(۱) ان میں سے مثبت سبب کا کریڈٹ تو مولانا مفتی محمودؒ کی قائم کردہ ایم آر ڈی کو جاتا ہے جس نے قومی سطح پر بحالی جمہوریت کی تحریک چلا کر محاذ آرائی کو اُفقی سمت میں موڑے رکھا اور سیاسی عناصر کی توجہات کو جمہوریت کی بحالی اور مارشل لاء کے خاتمے پر مرکوز کر کے لسانی اور علاقائی تقسیم اور اس سے پیدا ہونے والی عمودی محاذ آرائی کو پس منظر میں دھکیل دیا۔ چنانچہ ۸۳ء اور ۸۶ء میں دو مرتبہ سندھ میں جو آتش فشاں پھٹا وہ بحالی جمہوریت ہی کے نام پر پھٹا، یہ دوسری بات ہے کہ دونوں بار اس سے جو لاوا برآمد ہوا وہ سندھی نیشنلزم ہی کا پیدا کردہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان دونوں مواقع پر یہ تحریک جو اصلاً ملک گیر تھی، صرف صوبۂ سندھ اور اس کے بھی صرف اندرونی دیہی علاقوں کی عوامی شورش کی صورت اختیار کر کے رہ گئی۔

(۲) اب تک کے بچاؤ کی دوسری اور منفی وجہ سندھی نیشنلزم کی انتہا پسند قیادت اور اسلام اور پاکستان کے دشمنوں کی یہ حقیقت پسندی (REALISM) ہے، جس پر وہ بلاشبہ "شیطان کو بھی اُس کا حق ادا کرو" (GIVE THE DEVIL HIS DUE) کے اصول کے مطابق داد کے مستحق ہیں، کہ وہ بیک وقت پاکستان آرمی، پنجابی آبادکاروں اور اُردو بولنے والے مہاجروں سے مقابلہ نہیں کر سکتے۔ لہٰذا انہوں نے یہ دوہری حکمت عملی اختیار کی

کہ ایک طرف اپنی اصل قوت کو کسی براہ راست تصادم سے بچا کر گویا محفوظ (RESERVE) رکھا جائے اور اس سے صرف نظریاتی پرچار کا کام لے کر اپنے حلقۂ اثر اور دائرہ نفوذ کو بڑھایا جاتا رہے اور انتظار کیا جائے کہ حکومت پاکستان کے عمائدین اور تحریک بحالی جمہوریت کے قائدین میں سے کسی ایک یا دونوں کی بے بصیرتی اور بے تدبیری سے ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ مشرقی پاکستان کی طرح سندھ میں بھی بھارت کو دخل اندازی کا کوئی جھوٹ موٹ کا بہانہ حاصل ہو جائے اور اس طرح اُن کی تمنا بآسانی بر آئے!۔
اور چونکہ یہ مقصد صرف اس طرح حاصل ہو سکتا تھا کہ حکومت پاکستان اور ایم آر ڈی کے مابین کشمکش طول کھینچے اور اس میں زیادہ سے زیادہ تلخی پیدا ہو لہٰذا مسٹر جی ایم سید اور اُن کے حواری ایم آر ڈی میں شامل جماعتوں پر طنز و طعن کے تیر برسا کر اُن کے لیے گویا "تیز ترک گامزن" کی صورت بھی پیدا کرتے رہے اور مارشل لاء کے تسلسل کو خوش آئند قرار دینے کے علاوہ صدر ضیاء الحق کی ذاتی خوش اخلاقی کی تعریفیں بھی کرتے رہے۔
انتہا پسند سندھی قوم پرستی کی دوہری حکمت عملی کا دوسرا اور زیادہ خطرناک رُخ یہ تھا کہ ایسی تدابیر اختیار کی جائیں کہ سندھ میں آباد غیر سندھی اقوام آپس میں لڑ پڑیں اور الفاظ قرآنی "وَيُذِيقَ بَعْضَكُم بَأْسَ بَعْضٍ" (سورۃ انعام: آیت نمبر ۶۵) کے مطابق آپس ہی میں ایک دوسرے ہی کی قوت کا مزہ چکھیں۔ اور اس طرح بجائے اس کے کہ 'سندھو دیش' کی آبیاری قدیم سندھیوں کے خون سے ہو، اس درخت کی جڑوں کو 'دشمنوں' ہی کے خون سے سینچا جائے! ——— چنانچہ انتہا پسند سندھی قیادت نے ۱۹۸۳ء کے فوراً بعد ہی اس برملا اعتراف کے ساتھ کہ ہم نے بیک وقت دو محاذوں پر جنگ چھیڑ کر غلطی کا ارتکاب کیا تھا، آئندہ کے لیے اپنی اس نئی حکمت عملی (STRATEGY) کا کھلم کھلا اظہار شروع کر دیا تھا کہ آئندہ ہم پنجابیوں اور مہاجروں کو 'ISOLATE' کر کے ان دونوں سے باری باری اور علیحدہ علیحدہ نمٹیں گے۔ چنانچہ ابتداءً تو یہ کہا گیا کہ پنجابی اور سندھی تو فرزندانِ زمین بھی ہیں اور اُن کے مابین ہزاروں سال پرانے تہذیبی و ثقافتی مراسم بھی ہیں۔ جبکہ اردو بولنے والے "مکڑ" بھک منگے "پناہ گیر" ہیں جن سے چھٹکارا حاصل کرنا پنجابیوں

اور سندھیوں دونوں کے لیے ضروری ہے۔ لیکن جب یہ محسوس ہوا کہ یہ دال گلنی مشکل ہے اور سندھ میں پنجابیوں کی تعداد بھی بہت کم ہے جبکہ تعداد کے اعتبار سے کسی درجے میں مقابلے میں آنے کے قابل اور خاص طور پر سندھ کے شہروں پر "قابض" تو مہاجر ہیں تو رُخ بدل کر یہ کہا جانے لگا کہ مہاجرین یعنی نئے سندھی اور پرانے اور اصل سندھی تو آپس میں بھائی بھائی ہیں اور انہیں ہمیشہ سندھ ہی میں رہنا ہے، البتہ پنجاب کے لوگ سندھ میں ایک خارجی اور بدیسی عنصر کی حیثیت رکھتے ہیں اور فی الحقیقت وہی سیاسی اور معاشی دونوں اعتبارات سے اصل استحصالی طاقت بھی ہیں، لہٰذا نئے اور پرانے سندھیوں کو متحد ہو کر اُن سے گلوخلاصی کی کوشش کرنی چاہیے۔ چنانچہ یہی ہے وہ فلسفہ اور حکمتِ عملی جس کی کوکھ سے سندھ میں مہاجرین کے ردِّعمل کے تیسرے دَور کا آغاز ہوا تھا اور سندھی نیشنلزم کے انتہاپسند علمبرداروں اور اسلام اور پاکستان کے کھلے دشمنوں کی ہوشیاری اور چابک دستی کو ایک بار پھر داد دینی پڑتی ہے کہ گزشتہ دو تین سال کے دَوران حالات واقعتہً اُن ہی کے بنائے ہوئے نقشے کے مطابق آگے بڑھتے نظر آ رہے تھے۔ چنانچہ ایک جانب سندھی قوم پرستوں اور مہاجر رہنماؤں کے مابین ملاقاتوں اور مذاکرات کا سلسلہ شروع ہوا جس کے نتیجے میں "سندھ یونٹی بورڈ" کی قسم کے ادارے وجود میں آتے اور دوسری طرف عوامی سطح پر گلی کوچوں میں "مہاجر سندھی بھائی بھائی۔ تیسری قوم کہاں سے آئی" کے 'ترانے' سنائی دینے لگے اور نوبت بایں جارسید کہ کراچی کے بعض تعلیمی اداروں کے بارے میں خبریں ملیں کہ وہاں طلبہ کی باہمی محاذ آرائی اسی اساس پر استوار ہو گئی ہے کہ ایک جانب قدیم سندھی اور اُردو بولنے والے مہاجر طلبہ کا متحدہ محاذ ہے اور دوسری طرف پنجابی طلبہ۔ لیکن ابھی یہ معاملہ ابتدائی مراحل ہی میں تھا اور طالب علموں کے حلقے سے شروع ہونے والی بات کو گلی کوچوں تک آنے کے لیے ابھی کچھ مزید وقت درکار تھا کہ اچانک مہاجرین کی نوجوان نسل کی "تنگ آمد بجنگ آمد" والی نفسیاتی کیفیت نے ایک نیا 'دھماکہ' کر دیا۔

مہاجر پٹھان تصادم

اِس تازہ دھماکے سے مراد، ظاہر ہے کہ، وہ انتہائی خوفناک اور وحشیانہ خونی تصادم ہے جو سندھ میں 'مہاجرین' کے دو سب سے بڑے مراکز یعنی کراچی اور حیدر آباد میں 'اردو بولنے والوں' اور پٹھانوں کے مابین ہوا اور جسے پاکستان کے اساسی نظریے اور مسلم قومیت کے تصوّر کے تابوت میں آخری کیل یا مریض کی آخری ہچکی نہیں تو کم از کم خطرے کے آخری سگنل سے ضرور تعبیر کیا جا سکتا ہے!

اِس انتہائی افسوسناک تصادم کے بارے میں تاحال نہ خود راقم الحروف کسی نظریاتی پس منظر یا کسی سوچی سمجھی اسکیم کا سراغ لگا سکا ہے ــــــــ نہ ہی کسی اور مبصر یا تجزیہ نگار نے ایسی کسی چیز کی نشاندہی کی ہے۔ اور اس کے اصل اسباب میں سوائے دو عوامل کے، کوئی تیسرا سبب کم از کم بظاہر احوال نظر نہیں آتا: (یہ دوسری بات ہے کہ مستقبل میں ثانوی طور پر اسے ملک و ملّت کے دشمن اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کریں، جس کے بعض آثار ظاہر ہو بھی رہے ہیں۔)

(۱) اِس کا پہلا سبب مہاجرین کی نوجوان نسل کی وہ مایوسی اور بددلی ہے جس کے تاریخی پس منظر اور اسباب و عوامل کا بیان بھی تفصیلاً ہو چکا ہے اور جس میں درجہ بدرجہ تیزی و تندی، اور غصّے اور جھنجھلاہٹ کے اضافے کی داستان بھی بیان ہو چکی ہے۔ یہاں یہ مزید نوٹ کر لیا جائے کہ یہ احساسات و کیفیات بھارت کے دوسرے علاقوں سے تعلق رکھنے والے مہاجرین کے مقابلے میں بہاری مسلمانوں میں نہایت شدید ہیں۔ اس لیے کہ ۱۹۴۷ء میں مسلمانوں کا قتلِ عام بھی یا مشرقی پنجاب اور کسی قدر دہلی اور اس کے گرد و نواح میں ہوا تھا یا بنگال و بہار میں۔ اور ان علاقوں سے مسلمانوں کا انخلا جبری بھی تھا اور پُرتشدّد بھی۔ جبکہ جنوبی ہند کے علاوہ یوپی، سی پی اور راجپوتانہ سے مسلمانوں کی ہجرت زیادہ تر اختیاری بھی تھی اور نسبتاً پُرامن بھی۔ مزید برآں ۱۹۷۱ء کی قیامت تو تقریباً کلیتہً ٹوٹی ہی صرف بہاری مسلمانوں پر۔ جن میں سے کئی لاکھ آج پندرہ سال گزر جانے کے باوجود

بھی بنگلا دیش میں "ثُمَّ لَا یَمُوْتُ فِیْھَا وَلَا یَحْیٰی" (سورۃ الاعلیٰ: آیت نمبر ۱۳) "پھر اُس میں نہ جئیں گے نہ مریں گے" کی کیفیت میں مبتلا ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اس قسم کے حالات میں اگر انسان ہوش کھو بیٹھے اور جذبات سے مغلوب ہو جائے تو اسے دوش نہیں دیا جا سکتا۔

(۲) اس کا دوسرا سبب یہ ہے کہ شہروں کے معاملے میں کسی منصوبہ بندی اور کنٹرول کے فقدان کی بنا پر بالکل خودرو جھاڑیوں کی مانند پھیل جانے والی بستیوں اور بجلی کی سی سُرعت کے ساتھ بڑھنے والی آبادی کی بنا پر شہری زندگی کی مشکلات میں بے پناہ اضافہ ہو گیا ہے جن میں ٹریفک کے مسائل سرفہرست ہیں —— پھر جس طرح زندگی کے دوسرے شعبوں میں ابتری اور افراتفری کا دَور دورہ ہے اسی طرح اس شعبے میں بھی بدعنوانیاں، اور بے پرواہی اور سنگدلی کے مظاہر عام ہیں جن کی بنا پر ٹریفک کے حادثات اور انسانی جانوں کا ضیاع روز افزوں ہے —— یہ صورتِ حال یوں تو ملک کے تمام ہی بڑے شہروں میں موجود ہے۔ لیکن "حصّہ بقدرِ جُثّہ" کے اصول کے مطابق اور اُس پر مستزاد بعض دوسرے عوامل کی بنا پر کراچی میں انتہائی شدّت کے ساتھ پیدا ہو گئی ہے۔

کراچی کی مزید بدقسمتی یہ ہے کہ وہاں ایک طرف اِس شعبۂ زندگی سے تعلق رکھنے والے اکثر و بیشتر لوگ، یعنی منی بسوں، ویگنوں اور ٹیکسیوں کے مالک اور ڈرائیور نہ صرف ایک ہی قوم بلکہ زیادہ تر ایک ہی علاقے کے باشندے ہیں یعنی وزیرستان کے قبائلی پٹھان، اور دوسری طرف کراچی کی آبادی کی عظیم اکثریت ویسے بھی اُردو بولنے والے 'مہاجرین' پر مشتمل ہے، مزید برآں بعض گنجان آباد علاقے جن میں سے کراچی کی مضافاتی بستیوں کا تیز و تند اور اندھا دھند ٹریفک گزرتا ہے اور جنہوں نے ٹریفک کی فنی اصطلاح کے مطابق "بوتلوں کے تنگ دہانوں" (BOTTLE-NECKS) کی صورت اختیار کر لی ہے، وہاں کی آبادی صد فی صد مہاجرین پر مشتمل ہے۔ اس طرح کراچی میں ٹریفک کی مخصوص صورتِ حال نے دو 'قومیتوں' کے مابین ابتداءً شکر رنجی اور پھر باضابطہ کشیدگی پیدا کر دی۔

چنانچہ ایک جانب معاشی اور معاشرتی مسائل اور شہری زندگی کی عام مشکلات کی بنا پر اعصاب کے مستقل تناؤ اور دوسری جانب اندھا دھند ڈرائیونگ کے نتیجے میں رونما ہونے والے ٹریفک کے حادثات کا یہ نتیجہ تو کئی سال سے نکل رہا تھا کہ جہاں کسی حادثے میں کوئی انسانی جان ضائع ہوئی فوراً متعلقہ بس یا منی بس یا ویگن نذر آتش کردی گئی۔ جب بات اور آگے بڑھی تو آتش غیظ و غضب نے صرف متعلقہ گاڑی ہی نہیں مزید گاڑیوں کو بھی بھسم کرنا شروع کر دیا۔ اور اس طرح دو 'قومیتوں' کے درمیان کشیدگی میں اضافہ ہوتا چلا گیا جس نے بڑھتے بڑھتے 'تصادم' کی صورت اختیار کر لی جس کا عنوان ابتداً "بہاری پٹھان تصادم" بنا تھا جس کی ایک نہایت افسوسناک صورت کچھ عرصہ قبل اورنگی ٹاؤن، پٹھان کالونی اور بنارس چوک کے علاقے میں پیدا ہوئی تھی جس کے ضمن میں بعض نہایت دلدوز اور لرزہ خیز واقعات بھی اخبارات میں رپورٹ ہوئے تھے۔ چنانچہ حساس اور صاحب شعور لوگوں کا ماتھا اسی وقت ٹھنکا تھا کہ ؎ "یہ ڈرامہ دکھائے گا کیا سین۔ پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ!" ——— لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب وہ پردہ اکتوبر ۱۹۸۶ء کے آخری دن اور نومبر کے ابتدائی ایام میں اچانک اٹھا تو جو بھیانک منظر سامنے آیا اور اس تصادم نے مزید وسعت اختیار کر کے "مہاجر پٹھان آویزش" کی جو صورت اختیار کی اس کا کسی بڑے سے بڑے صاحب بصیرت انسان کو بھی اندازہ نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ ان ایام میں رونما ہونے والے واقعات و حوادث نے وحشت و بربریت کے اعتبار سے نہ صرف یہ کہ کم از کم مغربی پاکستان کی پوری چالیس سالہ تاریخ کے جملہ ریکارڈ توڑ ڈالے ——— بلکہ بلا مبالغہ ۱۹۴۷ء اور ۱۹۷۱ء کی یاد تازہ کردی!

حالات کی پیچیدگی اور منطقی نتیجہ

انتہا پسند سندھی قوم پرستوں کے نزدیک تو یہ مہاجر پٹھان تصادم بھی یقیناً بہت خوش آئند ہوگا۔ اس لیے کہ اُن کے نزدیک تو سندھ کی سرزمین پر ہر غیر سندھی ناپسندیدہ

ہے خواہ وہ مہاجر ہو یا پنجابی یا پٹھان ۔ اور ان میں سے کوئی سے دو فریق بھی آپس میں لڑیں اُن کی منزلِ مقصود بہر صورت قریب آتی ہے ۔ لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ بہت اہم ہے کہ یہ تصادم اُن کے موجودہ نقشۂ کار کے مطابق نہیں ہوا بلکہ اس نے اُنہیں فوری طور پر ایک مشکل سے دوچار کر دیا ہے ۔ اِس لیے کہ اِس وقت اُنہیں وسیع تر ملکی سیاست کی سطح پر پنجاب کے خلاف پٹھانوں اور بلوچوں دونوں کا تعاون درکار ہے ۔ جس کے حصول کی سعی کا مظہرِ اوّل ممتاز بھٹو اور حفیظ پیرزادہ کا "سندھی بلوچی پختون متحدہ محاذ" ہے اور مظہرِ ثانی سندھی نیشنلزم کے گرو مسٹر جی ایم سیّد اور سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خان کے مابین حال ہی میں شدّت اختیار کرتے والی محبت اور خیر سگالی ہے ——— اور مقامی سطح پر سندھ میں وہ فی الوقت لڑانا چاہتے تھے مہاجروں اور پنجابیوں کو، جبکہ بالفعل تصادم ہو گیا مہاجروں اور پٹھانوں میں ۔ گویا اُن کے موجودہ نقشۂ کار کے مطابق اُن کے دو دوست اور اتحادی آپس میں لڑ پڑے ہیں، یہی وجہ ہے کہ 'بابائے سندھ' ایک جانب در پردہ پیٹھ ٹھونک رہے ہیں مہاجر قومی موومنٹ کی اور دوسری جانب تعزیتی پیغام ارسال کر رہے ہیں بابائے پختون باچا خان کی خدمت میں ۔ (چنانچہ اسی اساس پر مہاجر اتحاد تحریک' مہاجر قومی موومنٹ کو ہدفِ تنقید بنا رہی ہے)

اِس سے بھی بڑی پیچیدگی جو نوشتۂ دیوار کے مانند ہر صاحب عقل و بصیرت کے سامنے ہے، (خواہ کوئی اُسے اپنی کسی وقتی مصلحت کے تحت کتنا ہی نظر انداز کرنا چاہے ۔) وہ یہ ہے کہ اگر موجودہ صورتِ حال میں کوئی انقلابی تبدیلی نہیں آتی اور متحدہ مسلم قومیت کے متعدد قومیتوں میں تحلیل ہونے کا عمل جاری رہتا ہے تو اس کا لازمی اور منطقی تقاضا وہی ہے جو مہاجر نوجوانوں کی دونوں فعال تحریکوں کا مشترک نعرہ بن گیا ہے یعنی یہ کہ ایک کروڑ کے لگ بھگ اُردو بولنے والوں کو بھی ایک مستقل اور جداگانہ قومیت کی حیثیت سے تسلیم کیا جائے جس کا آخری منطقی نتیجہ سندھ کی تقسیم ہو گا جسے سندھی قوم پرستی کسی صورت میں برداشت نہیں کر سکتی ۔ لہٰذا اگر حالات کا رُخ یہی رہتا ہے جواب ہے تو اصل مقابلہ اور ہولناک ترین تصادم قدیم اور جدید سندھیوں ہی کے مابین ہو گا جس کے

ضمن میں حال ہی میں مکہ مکرمہ میں مقیم ایک دینی مزاج کے حامل سندھی دانشور کی زبان سے نہایت گہرے تأثر کے ساتھ جو الفاظ نکلے انہیں سُن کر راقم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے کہ ——— "ڈاکٹر صاحب! بہت خون بہے گا!"

الغرض! برعظیم ہندوپاک کے اوّلین "بابُ الاسلام" سندھ کی موجودہ صورتِ حال بالکل وہی ہے جس کی جانب عظیم فتنوں کی پیشین گوئیوں پر مشتمل احادیث نبویہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) میں اشارات ملتے ہیں کہ اُن کے دوران اپنے اور غیر کے مابین تمیز اور دوست دشمن کی پہچان ناممکن ہو جائے گی اور اچھے اچھے صاحب عقل و بصیرت لوگ بھی حیران و پریشان کھڑے رہ جائیں گے کہ ع "کس طرف جاؤں، کدھر دیکھوں، کسے آواز دوں!" یہی وجہ ہے کہ راقم نے اس سلسلہ مضامین کا عنوان بنایا تھا حضرت اکبر کے اِس شعر کو کہ ؎

جہاں ہستی ہوئی محدود، لاکھوں پیچ پڑتے ہیں!
عقیدے، عقل، فطرت سب کے سب آپس میں لڑتے ہیں

شر میں سے خیر

منطقی اعتبار سے متذکرہ بالا صورتِ حال کے دو ہی نتائج ممکن ہیں: یا کامل تباہی، یا کوئی فوری انقلابی تبدیلی اور بالکل جڑ بنیاد سے نئی تعمیر اور نشأۃ ثانیہ! ——— اور اگر حالات کے رُخ اور واقعات کی رفتار کا صُغریٰ کبریٰ جوڑا جاتے تب تو مقدم الذکر ہی کے دَل بادل چھائے نظر آتے ہیں لیکن ؎

"تقدیر تو مبرم نظر آتی ہے ولیکن — پیرانِ کلیسا کی دعا ہے کہ یہ ٹل جائے!"

کے مصداق ہر مومن و مسلم اور ہر مخلص پاکستانی کی دعا تو یہی ہو گی کہ ؎

"رحم کر اپنے نہ آئینِ کرم کو بھُول جا — ہم تجھے بھولے ہیں لیکن تو نہ ہم کو بھول جا!"

مزید برآں، ہمارا ایمان ہے کہ اللہ ہر شے پر قادر ہے اور جو بھی ارادہ فرمالے اُسے

پورا کرگزرنے والا ہے ـــــ اور اُس کی شان یہ ہے کہ "یُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَ یُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ وَیُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا" (سورۃ روم: آیت نمبر۱۹۔ ترجمہ: "وہ نکال لاتا ہے زندہ کو مردہ میں سے اور مردہ کو زندہ میں سے اور زندہ کر دیتا ہے زمین کو اُس کے مُردہ ہونے کے بعد") لہٰذا اُس کے رحم وکرم اور قوّت و قدرت سے ہرگز بعید نہیں کہ وہ موجودہ صورتِ حال کو یکسر تبدیل کر دے ـــــ اور الحمدُلِلّٰہ کہ ان سطور کے عاجز و ناچیز راقم کی "چشمِ قلب" (MIND'S EYE) "مہاجر سندھی بھائی بھائی" کے نعرہ ہی میں جو اصلاً انتہا پسند سندھی نیشنلزم کی جنگی حکمتِ عملی کا مظہر بن کر سامنے آیا ہے، ایک ممکنہ خیر کا پہلو دیکھ رہی ہے اور ان شاءاللہ العزیز "وَمَکَرُوْا وَمَکَرَ اللّٰہُ وَاللّٰہُ خَیْرُ الْمَاکِرِیْنَ" (سورۃ آلِ عمران: آیت نمبر۵۴، ترجمہ "اور انہوں نے چال چلی اور اللہ نے بھی چال چلی اور اللہ تو سب سے بہتر چال چلنے والا ہے ہی!) کے مصداق اسلام اور پاکستان کے دشمن خود اپنی ہی تدبیروں کے ہاتھوں مات کھائیں گے ـــــ بقول علامہ اقبالؔ ؎

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے — کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِکم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کریگی — جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

چنانچہ اگر اللہ نے چاہا تو قدیم سندھی مسلمانوں اور ہندوستان سے ہجرت کرکے پاکستان آنے والوں ہی کے دینی اتحاد سے برِعظیم ہند و پاک میں اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کے لیے سب سے مؤثر قوّت فراہم ہوگی۔ اس لیے کہ ایک طرف صنم خانۂ ہند میں اسلام کی قدیم ترین اور عربی الاصل روایات کی امین سرزمینِ سندھ ہے اور دوسری طرف ہندوستان کے مختلف علاقوں سے 'اختیاری ہجرت' کرکے پاکستان آنے والے مہاجرین اُس وقت بھی جذبۂ ملی سے دوسروں کی نسبت زیادہ سرشار تھے اور گوناگوں قسم کی مایوسیوں اور حالات کی شدید ابتری کے باوجود اِن میں تاحال بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو "ایک بلبل ہے کہ ہے محوِ ترنم اب تک ۔ اُس کے سینے میں ہے نغموں کا تلاطم اب تک!" کے مصداق دینی و ملّی جذبے کی وافر مقدار سے بہرہ ور ہیں اور اُن کے دل کے کانوں میں اب بھی

علامہ اقبال کا یہ ترانۂ ملی گونج رہا ہے کہ "چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا۔ مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا!" مزید برآں ان میں ایک معتدبہ تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہے جنہیں بجا طور پر برعظیم پاک و ہند میں 'الف ثانی' یعنی امتِ مسلمہ کے دوسرے ہزار سالہ دور کی چار سو سال پر محیط تجدیدی مساعی کا وارث قرار دیا جا سکتا ہے۔

اور اب ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ ان دونوں طبقات میں سے اُن لوگوں کی غیرتِ دینی اور حمیتِ ملی کو للکارا جائے جو اللہ، اس کے رسولؐ، اس کی کتاب اور اس کے دین کے ساتھ ؎ "جو تجھ سے عہدِ وفا استوار رکھتے ہیں" کے مصداق خلوص و اخلاص کا تعلق رکھتے ہوں اور انہیں آمادہ کیا جائے کہ وہ ؎ "میری دنیا لٹ رہی تھی اور میں خاموش تھا!" پر عمل کرنے اور ملک و ملت کے مستقبل کو جذباتی نوجوانوں کے حوالے کر کے خود گوشۂ عافیت میں پڑے رہنے کی روش کو ترک کریں اور وقت کی نزاکت اور حالات کی سنگینی کا احساس کرتے ہوئے ؎ "نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیریؓ!" کے مطابق کمرِ ہمت کس کر میدانِ عمل میں اتر آئیں۔

اگر ایسا ہو جائے تو کیا عجب اللہ تعالیٰ انہیں الفاظِ مبارکہ "وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَكَانُوْٓا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا" (سورۃ فتح: آیت نمبر ۲۶۔ ترجمہ "اور اس تعالیٰ نے چسپاں کر دی اُن پر تقویٰ کی بات اور وہ اس کے حقدار بھی تھے اور اہل بھی") کا مصداق بنا دے اور چشمِ فلک ایک بار پھر وہ نظارہ دیکھ سکے جو اس نے آج سے تقریباً ڈیڑھ سو سال قبل رائے پور اور پیر جو گوٹھ کی خانقاہوں میں سید احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل شہید دہلوی رحمۃ اللہ علیہما اور اُن کے ان ساتھیوں کی مہمان نوازی اور خاطر مدارات کی صورت میں دیکھا تھا جن کا تعلق دہلی و یوپی، بنگال و بہار اور راجپوتانہ وغیرہ کے علاقوں سے تھا۔!

البتہ یہ کب اور کیسے ہو سکتا ہے؟ اس کے جواب کے لیے ہمیں موجودہ خوفناک صورتحال کے پس منظر اور اسباب و عوامل کا جائزہ لینے کے بعد اب یہ سوچنا ہوگا کہ اس کا بنیادی اور مستقل علاج کیا ہے اور اس مزمن مرض میں جو ثانوی پیچیدگیاں پیدا ہو گئی ہیں اُن کے ازالے کیلئے کیا فوری اقدامات ضروری ہیں۔ چنانچہ ان شاء اللہ آئندہ صحبت میں اسی موضوع پر گفتگو ہوگی۔

تشخیص و علاج

اصل سبب کیا؟ اور ذمّہ دار کون؟

مستقل علاج اور فوری تدابیر

اصل سبب کیا؟ اور ذمہ دار کون؟

۹ نومبر ۸۶ء کو مکہ مکرمہ میں راقم نے قلم اُٹھایا تو تھا "پاکستان میں اسلامی انقلاب: کیا، کیوں، اور کیسے؟" کی تسوید کے لیے لیکن چونکہ اُن دنوں کراچی میں حالات بہت تشویشناک تھے اور جمعہ ۳۱ اکتوبر کو مہاجر قومی موومنٹ کی بسوں پر سہراب گوٹھ کے علاقے میں فائرنگ سے کراچی اور حیدر آباد میں اردو اور پشتو بولنے والوں کے مابین جس خونی تصادم کا آغاز ہوا تھا اور حجاز جاتے ہوئے ۳ نومبر کو کراچی میں ایک روزہ قیام کے دوران جو حالات سننے میں آئے تھے اور پاکستان کے اس "عروس البلاد" کو جس حال میں دیکھا تھا اس کا طبیعت پر بے حد اثر تھا، مزید برآں اس سے متصلاً قبل صوبہ سرحد کے حالات و واقعات، پھر پنجاب کے شیعہ سنی فسادات اور کوئٹہ میں پٹھانوں اور بلوچوں کے مابین مسلح تصادم کی خبروں سے بھی دل بہت مغموم اور متفکر تھا، لہٰذا اشہب قلم نے بے اختیار پہلے تو "پاکستان کے عدم استحکام کی نئی جہتوں" کی جانب رُخ کیا اور اس کے بعد "مسئلہ سندھ" کی پیچ در پیچ گھاٹیوں کی طرف دوڑ لگادی ——— اور چونکہ راقم کے یہ الفاظ کسی تکلف یا تصنع پر بلکہ اس کے حقیقی اور واقعی احساسات پر مبنی ہیں کہ:۔

• راقم کے اندازے کے مطابق آئندہ چند سال کے دوران میں نہ صرف یہ کہ پاکستان کی قسمت اور اس کے ضمن میں "TO BE OR NOT TO BE"

کا فیصلہ سرزمین سندھ میں ہوگا بلکہ خود سندھ کی سعادت وشقاوت کا آخری فیصلہ بھی ہو جائے گا کہ آیا برِعظیم پاک و ہند کا یہ اوّلین 'باب الاسلام' جو پہلی صدی ہجری کے اواخر میں صنم خانۂ ہند میں توحیدِ ربانی اور حریت و اخوت و مساواتِ انسانی کے انقلاب آفریں پیغام کا 'مدخل' (یعنی داخل ہونے کی جگہ) بنا تھا' پندرھویں صدی ہجری کے آغاز میں اسلام کا 'مخرج' بلکہ 'مدفن' بنتا ہے ۔ ۔ ۔ یا یہ قطعۂ ارضی ۔ ۔ ۔ اوّلاً پاکستان' پھر برعظیم پاک و ہند اور بالآخر پورے عالمِ انسانی میں اسلام کی نشاۃِ ثانیہ اور غلبۂ دینِ حق کے نقطۂ آغاز کی صورت اختیار کرتا ہے"!

لہٰذا سندھ کے مسئلے پر بات لمبی ہوتی چلی گئی۔ اور چونکہ راقم کے نہاں خانۂ قلب میں اس امید کا چراغ بھی روشن تھا کہ:

> "کیا عجب کہ سندھ کے مسائل کا تجزیاتی مطالعہ پورے پاکستان کے مسائل کی پہچان کا ذریعہ بن جائے' اور ع 'روحِ مسلماں میں ہے آج وہی اضطراب' کے مصداق اس وقت سندھ جس 'بحرانی کیفیت' سے دوچار ہے اور جس اضطراب اور کرب میں مبتلا ہے کیا عجب کہ وہ کسی نئے عہدِ سعادت کی ولادت کے درد کی لہریں (BIRTH PANGS) ثابت ہوں اور اللہ شر سے خیر برآمد فرما دے۔"

لہٰذا راقم نے مقدور بھر تجزیے کا حق ادا کرنے کی کوشش کی ——— اس کے نتیجے میں جو کچھ اب تک رقم ہوا اُس نے "استحکامِ پاکستان" ہی کے ضمیمے یا تتمے کی صورت اختیار کر لی اور اصل موضوع پر گفتگو کا تا حال آغاز بھی نہیں ہو سکا!

جس طرح آج سے چار سال قبل جنرل محمد ضیاء الحق کے نام خط میں راقم نے سندھ کے بارے میں جن خدشات کا اظہار کیا تھا اسے مخالفین نے تو خللِ دماغی سے تعبیر کیا تھا' اور احباب نے بھی شدتِ احساس کا مظہر قرار دیا تھا' (اگرچہ اس خط کی تحریر کے آٹھ دس ماہ کے اندر ہی سندھ میں ایم آر ڈی کی تحریک کے دوران جو لاوا اُبلا تھا اُس

۔۔نے راقم کے مشاہدات اور قیاسات کی پوری تصدیق کر دی تھی) بالکل اُسی طرح اکثر و بیشتر لوگوں نے "استحکامِ پاکستان" کے آخری باب کے ان الفاظ کو بھی مبالغے پر مبنی قرار دیا کہ:

"ایک جانب ہمارے قومی و ملّی وجود کا موجودہ دینی و مذہبی، دستوری و سیاسی اور اخلاقی و عملی 'منظر' اور اس کا چالیس سالہ 'پس منظر' جو بظاہر شیکسپیئر کے الفاظ "TO BE OR NOT TO BE IS THE QUESTION". کے سوالیہ نشان کے ساتھ ایک عقدۂ لاینحل کی صورت اختیار کر چکا ہے نتیجتاً ملک و ملّت بالکل اُس کیفیت میں نظر آ رہے ہیں جس کا نقشہ سورۂ آلِ عمران کی آیت نمبر ۱۰۳ میں ان الفاظ میں کھینچا گیا ہے کہ: وَكُنتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ" یعنی "تم لوگ آگ کے ایک گڑھے کے بالکل کنارے پر تھے"! اور بظاہر یہ محسوس ہوتا ہے کہ 'خاکم بدہن' مکمل تباہی ہمارا مقدر بن چکی ہے!

اسی طرح راقم کی نومبر دسمبر ۸۶ء کی تحریروں کو بھی عوام ہی نہیں اچھے بھلے تعلیم یافتہ اور دانشور لوگوں نے بھی قنوطیت پر مبنی اور یاسیّت پسندی (PESSIMISM) کا مظہر قرار دیا ——— لیکن جو کچھ کراچی میں وسط دسمبر میں ہوا اُس نے ہر شخص کے اعصاب کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے اور اس وقت ہر صاحبِ احساس و شعور انسان خائف اور پریشان نظر آ رہا ہے کہ ہم کدھر جا رہے ہیں؟ اور اس کا آخری نتیجہ کیا نکلے گا؟

اِن چند دنوں کے دوران کتنی جانیں ضائع ہوئیں، کتنے لوگ اپاہج ہوئے، کتنے گھر اُجڑے، کتنے کنبے نیست و نابود ہوتے، کتنے سہاگ لٹے، کتنے معصوم یتیم ہوئے، کتنوں کی ضعیفی کے سہارے ختم ہوئے، کتنے مکان نذرِ آتش ہوتے، کتنی دکانیں جلیں، کتنے کارخانے تباہ ہوئے، کتنی گاڑیاں بھسم ہوئیں ——— اور اِن سب سے بڑھ کر، ذہنوں میں کتنے فاصلے بڑھے، دلوں میں کتنی نئی نفرتوں نے جنم لیا، آتشِ غیظ و غضب کہاں تک پہنچی، اور انتقام در انتقام کا سلسلہ کتنا وسیع ہوا! اس کا صحیح اندازہ

مشکل ہی نہیں، ناممکن ہے! ـــــــــ مختصر یہ کہ پاکستان میں مختلف النوّع محرومیوں کے احساس کا سب سے بڑا مظہر اور سیاسی و معاشی، سماجی و معاشرتی، نسلی و لسانی اور تہذیبی و ثقافتی جملہ اقسام کے تصادموں کا سب سے بڑا مرکز سندھ بن گیا تھا، اور کراچی چونکہ سندھ ہی نہیں پورے پاکستان کا سب سے بڑا شہر ہے اور وہاں نسلی و لسانی 'اکائیاں' بالکل اُس کیفیت کے ساتھ باہم گڈمڈ اور گتھم گتھا ہیں جس کا نقشہ سورۂ کہف کے ان الفاظ مبارکہ میں سامنے آتا ہے کہ: "وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَّمُوجُ فِي بَعْضٍ" ترجمہ: "اور ہم کھلا چھوڑ دیں گے انہیں اُس دن کہ موجوں کے مانند ایک دوسرے میں گھس جائیں" لہٰذا محرومیوں اور مایوسیوں اور اُن کے پیچ در پیچ ردّعمل کا جو لاوا کئی سال سے اندر ہی اندر کھول رہا تھا وہ بالآخر پھٹا کراچی میں! اور نفرتوں اور عداوتوں کے اس بارود میں آگ لگی ـ پاکستان کے اِس 'عروس البلاد' میں جو دیکھتے ہی دیکھتے بیروت کی صورت اختیار کر گیا! اور وہاں ہندوستان کے کونے کونے سے آکر آباد ہونے والے مہاجروں پر وہ قیامت ٹوٹی کہ ۱۹۴۷ء کے المیے کی صرف یاد ہی تازہ نہیں ہوئی بلکہ اس کا عملی اعادہ (ACTION REPLAY) بھی ہو گیا! اور قدرت کی ستم ظریفی یہ کہ سب کچھ اس شہر میں ہوا جسے مہاجرین اپنا سب سے بڑا گڑھ سمجھتے ہیں اور سب سے محفوظ مامن (امن کی جگہ) بھی۔ چنانچہ ۷۲ء کے لسانی فسادات کے بعد بہت سے مہاجر کنبے، بالخصوص آسودہ حال تاجر اندرونِ سندھ سے کراچی منتقل ہو گئے تھے، وا حسرتا کہ آج زمانہ اُن سے بزبانِ حال و بالفاظِ جگر یہ کہہ رہا ہے کہ:

آسودۂ ساحل تو ہے مگر شاید یہ تجھے معلوم نہیں!!
ساحل سے بھی موجیں اٹھتی ہیں، خاموش بھی طوفاں ہوتے ہیں

جیسا کہ عام معمول ہے، اب بہت سے 'پنڈت' جاگ جائینگے اور نہ صرف یہ کہ حالات و واقعات کی بھرپور عکاسی ہوگی اور رنج و غم کا اظہار ہوگا بلکہ ایک سے بڑھ کر ایک تبصرے اور تجزیئے بھی تحریر ہوں گے ـــــــ لیکن اندیشہ ہے کہ اب بھی روایتی سطحیت اور ظاہر بینی ہی کا مظاہرہ ہوگا اور ساری توجہات فوری اسباب و عوامل ہی پر مرکوز ہو کر رہ جائیں

گی اور نہ گہرائی میں اُتر کر یہ دیکھنے کی کوشش ہو گی کہ اس صورتِ حال کا اصل سبب کیا ہے اور نہ اس پر غور ہو گا کہ اس کا اصل علاج اور مستقل حل کیا ہے؟

اصل سبب!

ان سطور کا عاجز و ناچیز راقم پوری طرح مطمئن ہے اور اس پر اللہ کا شکر ادا کرتا ہے کہ اُس نے اسی تعالیٰ کی توفیق سے اپنی تالیف "استحکام پاکستان" میں اِس المیے کا اصل سبب عمرانیات کے مسلّمہ دلائل اور سیاسیات کے ناقابلِ تردید شواہد کے حوالے سے بھی بیان کر دیا ہے اور حکمتِ قرآنی کی محکم اساسات اور قانونِ خداوندی کے اٹل اصولوں کی روشنی میں بھی واضح کر دیا ہے۔

چنانچہ حسبِ ذیل حقائق عمرانیات و سیاسیات کے تفصیلی دلائل کے ساتھ مبرہن کیے جا چکے ہیں کہ:

(۱) اگرچہ پاکستان کا قیام کسی مثبت اور فعال دینی جذبے کا مرہونِ منّت نہیں تھا بلکہ اصلاً برّعظیم پاک و ہند کے مسلمانوں کی قومی جدوجہد کا نتیجہ تھا۔ لیکن چونکہ مسلمانانِ ہند کی قومیّت کی بنیاد سوائے دین و مذہب کے اور کوئی نہیں تھی لہٰذا پاکستان کی اساس بھی صرف اور صرف اسلام ہے!

(۲) اس تاریخی پس منظر سے قطع نظر، پاکستان کے بقاء و استحکام کے لیے بھی نہ تاریخی تقدّس کا عامل موجود ہے، نہ ہی اُسے قدرتی اور محکم جغرافیائی حدود کا تحفّظ حاصل ہے، پھر کسی طاقتور قومی جذبے یا نیشنلزم کے لیے دنیا کی مروّجہ اساسات میں سے بھی کوئی ایسی اساس یہاں موجود نہیں جو کُل پاکستان سطح پر فعال انداز میں بروئے کار آسکے۔ چنانچہ ملکی سطح پر یہاں نہ کوئی نسلی نیشنلزم موجود ہے نہ لسانی، رہی وطنی قومیت تو وہ یہاں اس لیے قابلِ عمل نہیں کہ اُس کی کلّی نفی ہی کی بنیاد پر تو پاکستان کی تحریک چلائی گئی تھی ——— لہٰذا ع "کافر نتوانی شد، ناچار مسلماں شو!" کے مصداق پاکستان کے بقاء و استحکام کے لیے سوائے مذہبی جذبے کے کوئی اور سہارا موجود نہیں ہے!

(۳) لیکن اس ضمن میں اب وہ 'قومی مذہبیت' کفایت نہیں کر سکتی جو ہندو کے خوف کے باعث تقویت پاکر پاکستان کے قیام کا ذریعہ بن گئی تھی، بلکہ اب ایک ایسا فعال اور متحرک دینی جذبہ درکار ہے جس کی جڑیں حقیقی ایمان و یقین اور اسلام کے ساتھ واقعی اور عملی وابستگی میں گہری اتری ہوئی ہوں۔

(۴) اور چونکہ قیام پاکستان کے بعد اس سمت میں کوئی مؤثر اور حقیقی و واقعی پیش رفت نہیں ہوئی۔ لہٰذا مسلم قومیت کا جذبہ رفتہ رفتہ سرد پڑتا چلا گیا اور اس کی جگہ نسلی و لسانی قومیتوں اور علاقائی و صوبائی عصبیتوں نے لے لی۔ اور اب انہوں نے اتنی قوت حاصل کر لی ہے اور اتنی شدت پکڑ لی ہے کہ ان کے مابین خونی تصادم تک کی نوبت آگئی ہے اور کم از کم وقتی طور پر پاکستان میں 'مسلم قومیت' اس شعر کی مصداقِ کامل نظر آتی ہے کہ ؎

"دیکھ فانی وہ تری تدبیر کی میت نہ ہو اک جنازہ جا رہا ہے دوش پر تقدیر کے!"

اور کم از کم بظاہر تو یہی نظر آتا ہے کہ اب پاکستان کو ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے صرف کوئی 'معجزہ' ہی بچا سکتا ہے! -

مزید برآں خالص حکمتِ قرآنی کی اساسات اور قوانین و نوامیسِ الٰہیہ کی بنا پر واضح کیا جا چکا ہے کہ:۔

(۱) قیامِ پاکستان کا 'معجزہ' اس بنا پر ظہور میں آیا تھا کہ پورے برعظیم پاک و ہند کے مسلمانوں نے اللہ تعالیٰ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ پاکستان میں اُس تعؐ کے دین کا بول بالا کریں گے اور اُس نظامِ عدلِ اجتماعی کو نافذ کریں گے جو اس تعؐ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے عطا فرمایا تھا اور جو بالفعل اور بہ تمام و کمال عہدِ نبویؐ اور خلافتِ راشدہ کے دَوران قائم رہا تھا۔

(۲) اس وعدے کی مسلسل خلاف ورزی کی ایک سزا جو سورۃ توبہ کی آیت نمبر ۷۷ میں بیان شدہ سنّتِ الٰہی کے مطابق مسلمانانِ پاکستان کو ملی وہ اخلاق و کردار کا وہ شدید بحران اور نفاقِ عملی کا وہ ہمہ گیر تسلّط ہے جس سے ہم بحیثیت قوم دوچار ہیں۔ چنانچہ جھوٹ، خیانت، وعدہ خلافی اور ذرا سے اختلاف پر آپے سے باہر ہو جانے کے وہ چاروں اوصاف

پاکستان کے شہریوں کی عظیم اکثریت کے کردار کا جزو لاینفک بن گئے ہیں جو نفاق کی علامات کی حیثیت سے متعدد متفق علیہ احادیث نبویہ میں بیان ہوئے ہیں!

(۳) اس کی دوسری سزا وہ تشتت و انتشار یا 'نفاقِ باہمی' ۔ اور فرقوں اور گروہوں اور قومیتوں اور عصبیتوں کا وہ تصادم ہے جس کا نقشہ سورۃ الانعام کی آیت نمبر ۶۵ کے ان الفاظ مبارکہ میں کھینچا گیا ہے کہ: "اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ" ترجمہ: "یا تمہیں گروہوں میں تقسیم کرکے باہم ٹکرا دے اور تمہیں خود ایک دوسرے ہی کی جنگی قوت کا مزہ چکھاتے!

(۴) اس کی ایک انتہائی شدید اور ہولناک صورت ۱۹۷۱ء میں ظاہر ہوئی تھی جس کی بنا پر بھارت کو یہ جرأت ہوئی تھی کہ مشرقی پاکستان پر حملہ کرکے اُسے مغربی پاکستان سے علیحدہ بھی کر دے اور اُسے 'بنگلہ دیش' میں تبدیل کرکے مسلم قومیت کے خاتمے کا اعلان کرے!

تاہم مغربی پاکستان کی حد تک عذابِ خداوندی کا یہ کوڑا اُس سنّتِ الٰہی کا مظہر تھا جو قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر بیان ہوئی ہے اور کمالِ اختصار کے ساتھ سورۃ سجدہ کی آیت نمبر ۲۱ میں وارد ہوئی ہے یعنی: "وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ" ترجمہ: "اور ہم انہیں آخری اور بڑے عذاب سے قبل نسبتاً چھوٹے عذاب کا مزہ لازماً چکھائیں گے، شاید کہ وہ اپنی روش سے باز آجائیں!"

(۵) لیکن چونکہ ہم، مغربی پاکستان کے مسلمان، اس کے بعد بھی ہوش میں نہیں آئے اور ع "نہ تم بدلے، نہ ہم بدلے، نہ دل کی آرزو بدلی!" کے مصداق نہ ہماری انفرادی زندگیوں کے رنگ ڈھنگ میں کوئی فرق آیا نہ ہی قومی و اجتماعی سطح پر دین کی جانب کوئی فیصلہ کن پیش قدمی ہوئی لہٰذا اب بعینہٖ وہی صورتِ حال اس بچے کھچے پاکستان میں پیدا ہو چکی ہے اور گذشتہ دو تین ماہ کے دوران پنجاب کے شیعہ سُنّی فسادات، کوئٹہ کے بلوچ پختون تصادم اور سب سے بڑھ کر کراچی اور حیدر آباد میں پشتو اور اردو بولنے والوں کے مابین خانہ جنگی کی صورت میں اس کی جو شدّت ظاہر ہوئی ہے اُس کے پیشِ نظر اس وقت جو سب سے بڑی دعا کی جا سکتی ہے وہ یہی ہے کہ خدا کرے کہ یہ واقعات و حوادث بھی سابقہ

تنبیہات کے مانند ایک 'تنبیہ' ہی کی حیثیت رکھتے ہوں اور اللہ تعالیٰ آخری تباہی' یعنی 'عذاب اکبر' سے قبل اپنے خصوصی رحم و کرم کے طفیل ہمیں کچھ مزید مہلت عمل اور تلافی مافات کا ایک موقع عطا فرما دے! وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ! (اور یہ اللہ کے لیے کچھ مشکل نہیں ہے!)

ذمّہ دار کون؟

آگے بڑھنے سے قبل ایک نظر اس سوال پر بھی ڈال لی جائے کہ ہمارے اس قومی المیے کی ذمّہ داری کس پر ہے؟

اس سلسلے کی اوّلین اور اہم ترین حقیقت تو یہ ہے کہ حکمتِ قرآنی کی رُو سے قوموں اور معاشروں پر جو اجتماعی مصائب نازل ہوتے ہیں وہ اُن کے اپنے کرتوتوں کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ سورۂ شوریٰ کی آیت نمبر ۳۰ میں نہایت جامعیت و اختصار کے ساتھ یہ قاعدہ کلیہ بیان ہوا ہے کہ: "وَمَا اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ" ترجمہ: "اور جو مصیبتیں بھی تم پر آتی ہیں وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی کے طفیل آتی ہیں، اور تمہاری بہت سی بداعمالیوں سے تو اللہ درگذر بھی فرماتا رہتا ہے"! اور یہ بات تو قرآن حکیم میں بے شمار مرتبہ بیان ہوئی ہے کہ اللہ اپنے بندوں پر ہرگز ظلم نہیں کرتا ——— چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ ہماری موجودہ زبوں حالی اور تشویشناک صورتِ حال ع "اے بادِ صبا! ایں ہمہ آوردۂ تست"! کے مصداق بالکلیہ ہماری اپنی کوتاہیوں اور بداعمالیوں کا نتیجہ ہے اور اس وقت ہم پر سورۂ روم کی آیت نمبر ۴۱ کے یہ الفاظ صد فیصد منطبق ہوتے ہیں کہ "ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ" ترجمہ: "لوگوں کے کرتوتوں کی بنا پر خشکی اور تری ہر جگہ فساد رونما ہو چکا ہے"! ———

اور جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے، حالات کے تیور اتنے خطرناک ہیں کہ فی الوقت تو جو سب سے بڑی تمنا کی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ اس آیۂ مبارکہ کے آخری الفاظ بھی، جو سورۂ سجدہ کی محولہ بالا آیت نمبر ۲۱ کے مشابہ ہیں، یعنی: "لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِيْ

عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ○ ترجمہ: "تاکہ اللہ انہیں ان کے کچھ اعمال کا مزہ چکھائے، شاید کہ وہ (اپنی موجودہ روش سے) باز آجائیں" ہم پر صادق آجائیں اور موجودہ حالات آخری عذابِ ہلاکت کے آثار و مقدمات نہ ہوں بلکہ ایک تنبیہہ اور تازیانۂ عبرت کا کام کریں اور ہم ہوش میں آجائیں۔!

دوسری اہم حقیقت یہ پیش نظر رہنی ضروری ہے کہ قوموں کے اجتماعی فساد کی ذمہ داری اگرچہ اصلاً تو پوری قوم پر بحیثیتِ مجموعی عائد ہوتی ہے اور قوم کا کوئی فرد اس سے بالکلیہ بری الذمہ نہیں ہوتا، یہی وجہ ہے کہ سہ "فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے۔ نہیں کرتی کبھی ملت کے گناہوں کو معاف!" کے مطابق جب قوموں پر عذاب آتا ہے تو وہ سورۂ انفال کی آیت نمبر ۲۵ میں وارد شدہ الفاظ" وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاصَّةً" ترجمہ: "اور ڈرو اُس عذاب سے جو خاص طور پر صرف ان ہی کو لپیٹ میں نہیں لے گا جنہوں نے بالفعل ظلم کیا ہوگا!" کے مطابق گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے ــــــ تاہم سورۂ نور میں واقعۂ افک کے ضمن میں جو اصول بیان ہوا ہے یعنی "لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْاِثْمِ وَالَّذِيْ تَوَلّٰى كِبْرَهٗ مِنْهُمْ لَهٗ عَذَابٌ عَظِيْمٌ" ترجمہ: "ان میں سے ہر ایک نے جو گناہ کمایا وہ اس کا ذمہ دار ہے، رہا وہ جس نے سب سے بڑی ذمہ داری کا بوجھ اپنے سر لیا تو اس کے لیے تو بہت بڑی سزا ہے!" اس کے مطابق مختلف افراد، گروہوں اور طبقات کی ذمہ داری اُن کے مرتبہ و مقام، اہمیت و صلاحیت، اور اختیار و اقتدار کی نسبت سے کم یا زیادہ ہوتی ہے۔ چنانچہ عوام الناس کے مقابلے میں کہیں زیادہ ذمہ داری ان لوگوں اور طبقوں پر عائد ہوتی ہے جو سیاسی حیثیت و اقتدار کے مالک یا علمی و دینی مرتبہ و وجاہت کے حامل ہوں، یہی وجہ ہے کہ حضرت عبداللہ ابن مبارکؒ نے دین میں فساد و ابتری کا ذمہ دار سلاطین، علماء اور صوفیاء کو قرار دیا ہے۔ سہ

"وَمَا اَفْسَدَ الدِّيْنَ اِلَّا الْمُلُوْكُ وَاَحْبَارُ سُوْءٍ وَرُهْبَانُهَا"

یعنی دین میں بگاڑ عوام نہیں، بلکہ بدکردار بادشاہ، علماءِ سُوء اور دنیا دار راہب و درویش

پیدا کرتے ہیں، (علامہ اقبال کا یہ خیال بھی غالباً اسی شعر سے مستعار ہے کہ ع باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری اے کُشتۂ مُلائی و سلطانی و پیری!)

اس اصول پر قیاس کرتے ہوئے، ہمارے قومی المیے کی سب سے بڑی ذمہ داری بھی سیاسی زعماء و قائدین، علماء کرام، اور صوفیائے عظام ہی پر عائد ہوتی ہے ——— اور ان میں سے بھی "وَالَّذِیْ تَوَلّٰی کِبْرَہٗ" کا مصداق ایک جانب وہ سیاسی جماعتیں قرار پائیں گی جنہوں نے اسلام کے نعرہ کو سیاسی حربے کے طور پر استعمال کیا اور دوسری جانب وہ دینی و مذہبی تنظیمیں جنہوں نے اپنی توانائیاں فرقہ وارانہ اختلافات کی آگ کو بھڑکانے میں صرف کیں یا اپنے ترک و اختیار، ردّ و قبول، تقدیم و تاخیر، اور تائید و مخالفت کے لیے اصل معیار خالص سیاسی مصلحتوں کو بنا لیا ———

علٰی ھٰذا القیاس، ملک کے مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی ذمہ داری بھی یکساں اور برابر نہیں بلکہ کم و بیش ہے ——— اور اس ضمن میں بنیادی اصول یہ ہوگا کہ جن لوگوں کا حصہ قیام پاکستان کے سلسلے میں سب سے زیادہ تھا فطری اور منطقی طور پر وہی اس کی تعمیر و ترقی کے بھی سب سے بڑھ کر ذمہ دار تھے اور یہ ذمہ داری اصلاً اُن ہی کی تھی کہ وہ اس قافلۂ ملّی کو صحیح سمت میں رواں دواں رکھیں نہ کہ خود ہی ع "یہ صور پھونک کے تم سو گئے کہاں آخر!" کے مصداق بن جائیں! ——— لہٰذا پاکستان کے استحکام اور یہاں اسلام کے نفاذ و قیام کے ضمن میں اُن کی کوتاہی اگر دوسروں کے برابر ہو تب بھی وہ سب سے بڑھ کر ذمہ دار اور قصوروار قرار پائیں گے!

اس اصول کے مطابق پاکستان کے المیے کی ذمہ داری موجودہ پاکستان کے چاروں صوبوں میں پہلے سے آباد لوگوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ عائد ہوتی ہے اُن لوگوں پر جو ہندوستان کے مختلف علاقوں سے ترکِ وطن کر کے پاکستان آئے اور عرفِ عام میں 'مہاجر' کہلاتے ہیں، اس لیے کہ اس میں ہرگز کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ عالمِ اسباب میں پاکستان کے قیام کے سب سے بڑے کریڈٹ کے مستحق بھی وہی ہیں۔

ہر شخص جانتا ہے کہ تحریک پاکستان اصلاً ہندوستان کے مسلم اقلیت والے علاقوں ہی سے اُبھری تھی جہاں کے مسلمانوں کو ہندوؤں کے مزاج اور افتادِ طبع، اُن کے قلبی احساسات اور ذہنی رجحانات، اور اُن کے ارادوں اور منصوبوں کا علم ذاتی مشاہدے اور عملی تجربے کی بنا پر حاصل تھا، لہٰذا 'اکھنڈ بھارت' میں اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں سب سے بڑھ کر خوف اور خدشہ بھی اُن ہی کو لاحق تھا! عقل اور منطق کی رُو سے یہ صورت مسلم اکثریت والے علاقوں میں ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ صوبۂ سرحد اور بلوچستان میں، جہاں ہندو آٹے میں نمک کے مانند تھے، مسلم قومیت پر مبنی کسی تحریک کا سرے سے کوئی وجود ہی نہ تھا، چنانچہ سرحد میں آخر وقت تک کانگریس کی وزارت قائم رہی اور بلوچ سرداروں کی اکثریت نے بھی مجبوراً اور بادلِ ناخواستہ ہی پاکستان میں شمولیت قبول کی تھی۔ اسی طرح پنجاب اور سندھ میں بھی ۳۷ء تک تو مسلم لیگ کا وجود نہ ہونے کے برابر تھا، اور دونوں صوبوں میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کی مشترک جماعتوں کا طوطی بول رہا تھا یعنی پنجاب میں یونینسٹ پارٹی کا سکہ رواں تھا اور سندھ میں سندھ یونائیٹڈ پارٹی ہی سب سے بڑی جماعت تھی۔ چنانچہ پنجاب میں ۱۷۵ کے ہاؤس میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کل دو ممبر کامیاب ہوئے تھے اور اُن میں سے بھی ایک فوراً دوسروں سے جا ملا تھا! ——— اور سندھ میں تو ۵۸ کے ہاؤس میں ایک بھی مسلم لیگی نہ تھا۔

الغرض، تحریک پاکستان بنیادی طور پر ہندوستان کے مسلم اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کی تحریک تھی اور اکثریتی صوبوں کے مسلمان تو بعد میں ان کے معین و مددگار (یعنی 'انصار') بنے تھے، اور قیامِ پاکستان کا سہرا اصلاً ہندی مسلمانوں ہی کے سر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں قیامِ پاکستان کے وقت بھی بے پناہ قربانیاں دینی پڑی تھیں ——— اور وہ آج تک بھی اسی ناقابلِ معافی جرم کی بنا پر بھارت میں ہندو اکثریت کے معتوب ہیں کہ اُن ہی نے بھارت ماتا کے ٹکڑے کرائے تھے ——— لہٰذا ع "جن کے رتبے ہیں سوا، ان کی سوا مشکل ہے!" کے مطابق قیامِ پاکستان کے مقاصد کی تکمیل اور اُس سمت میں فیصلہ کن پیشقدمی کی ذمہ داری بھی سب سے بڑھ کر ان ہی لوگوں پر عائد ہوتی تھی جنہوں نے اقلیتی

صوبوں سے ترکِ وطن کرکے پاکستان میں سکونت اختیار کی ——— اور ان میں سے بھی خاص طور پر وہ جن کی یہ ہجرت، جبری نہیں اختیاری تھی! اور راقم کو یقین ہے کہ ایسے لوگوں میں سے قدرِ قلیل کے سوا اکثر و بیشتر لوگوں کی یہ نقلِ مکانی اصلاً مال و دولت کے حصول اور دنیوی امنگوں کی تکمیل کے لیے نہیں تھی بلکہ قومی و ملّی جذبات اور ملّتِ اسلامیہ کی نشأۃِ ثانیہ کے ولولہ و امنگ کی بنا پر تھی ——— پھر اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ان میں ایک بہت بڑی تعداد سرہند و سہارنپور، دیوبند و علی گڑھ، دہلی و اجمیر، لکھنؤ، اعظم گڑھ، فرنگی محل و رائے بریلی اور خیر آباد و عظیم آباد (پٹنہ) کی علمی، دینی اور روحانی وراثت کے حاملوں اور خاص طور پر تحریکِ شہیدینؒ کے جوشِ جہاد اور ذوقِ شہادت کے وارثوں پر مشتمل تھی!

اب اگر ان کی اکثریت بھی پاکستان آکر آزادی کے مادّی ثمرات ہی کو سمیٹنے میں منہمک ہوگئی اور انہوں نے کاروبار بھی چمکائے اور فیکٹریاں بھی تعمیر کیں، دولت بھی کمائی اور جائدادیں بھی بنائیں، عالی شان محل بھی تعمیر کیے اور دنیوی آسائشوں کے جملہ ساز و سامان بھی فراہم کیے لیکن نہ ملّت کی تعمیرِ نو کی جانب توجہ کی، نہ دین کے احیاء کی فکر کی، نہ سماجی انصاف اور سیاسی و معاشی عدل کے قیام کی جدّوجہد کی، نہ ملکی سیاست کو صحتمند خطوط پر پروان چڑھانے میں مؤثر حصّہ لیا، نہ قافلۂ ملّی کو صحیح سمت میں رواں رکھنے میں فیصلہ کُن کردار ادا کیا ——— بلکہ اس کے برعکس جس کے پاس چار پیسے آگئے اس نے اپنی سابقہ سماجی و معاشی روایات تک کو خیرباد کہہ کر مغربی تہذیب اور جدید طرزِ معاشرت کو اختیار کر لیا۔ تو محض یہ دلیل کہ ان امور میں مقامی لوگ یعنی پنجابی، سندھی، پٹھان اور بلوچ بھی تو ان سے پیچھے نہیں اور اس حمام میں تو سب ہی ننگے ہیں، انہیں اپنی خصوصی اور اضافی ذمہ داری سے بری نہیں کر سکتی!

چنانچہ یہی بات تھی جو راقم کی ایک تقریر کے حوالے سے اخبار میں شائع ہو گئی تھی جس پر "مہاجرین" کی جانب سے ناراضگی کا اظہار ہوا۔ حالانکہ میں گزشتہ کئی سالوں سے کراچی، حیدرآباد اور سکھر میں اپنے دروس و خطابات کے دوران عرفی کے " نوا را تلخ ترمی زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی!" پر عمل کرتے ہوئے اِس سے کہیں زیادہ تلخ انداز میں کہتا رہا ہوں کہ مہاجرین ہی ہوش میں آئیں! ورنہ اگر پاکستان پر اپنے مقصدِ قیام سے انحراف کی بنا پر

عذاب آیا تو اسکی شدید ترین صورت ان مہاجرین ہی کے حصّہ میں آئے گی۔ اور اسلامی عصبیت کے کمزور پڑنے سے جب علاقائی اور لِسانی قومیتوں کا سیلاب آئے گا تو اُس میں سب سے پہلے اُن کے گھروندے بہیں گے اور سندھی نیشنلزم کا جو طوفان تیزی سے اُٹھ رہا ہے وہ جب سر سے گزرا تو اُس سے جو تباہی اُن پر آئے گی اُس کا اِس وقت تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، مختصر یہ کہ وہ صورت بنے گی کہ ع "دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں!"
یہ دوسری بات ہے کہ " وَاِنْ اَدْرِیْٓ اَقَرِیْبٌ اَمْ بَعِیْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ " (سورۃ انبیاء: آیت ۱۰۹) ترجمہ " اور مجھے نہیں معلوم کہ جس عذاب کی خبر تمہیں دی جا رہی ہے وہ قریب ہی آن پہنچا ہے یا ابھی دُور ہے! " کے مصداق راقم کو قطعاً اندازہ نہ تھا کہ اُس عذاب کی پہلی قسط اتنی جلد آ جائے گی، اور وہ بھی مہاجرین کے گڑھ اور قلعے کراچی میں، مزید برآں انتہا پسند سندھی قوم پرستوں کے ہاتھوں نہیں بلکہ کچھ اور لوگوں کے ذریعے!!
چنانچہ راقم اس پر شدید صدمے کی کیفیت سے دوچار رہا اور ۳۰ نومبر ۱۹۸۶ء کو راقم نے کراچی کو جس حال میں دیکھا اور وہاں ظلم و بربریت کی جو داستانیں سُننے میں آئیں اُن کے باعث لگ بھگ ایک ہفتہ راقم پر سکتہ سا طاری رہا! اور اب بھی اُس کے دل و دماغ سخت صدمہ محسوس کر رہے ہیں، اس لئے کہ ع "بدنصیب اقبال کو بخشا گیا ماتم ترا!" کے مصداق بدقسمتی سے اُسے کسی قدر اندازہ ہے کہ معاملہ ع " ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا! " والا معاملہ ہے اور اگر حالات میں کوئی فوری اور انقلابی تبدیلی نہ آئی تو اس سے کہیں زیادہ بھیانک اور ہولناک صورتیں سامنے آئیں گی! اَللّٰھُمَّ اَعِذْنَا مِنْ ذٰلِکَ۔

پاکستان میں پہلے سے آباد لوگوں میں سے میرے نزدیک اُس کی تعمیر و ترقی اور اس میں اسلامی اقدار کے احیاء اور اسلام کے نظامِ عدل و قسط کے قیام کی سب سے زیادہ ذمّہ داری سندھی مسلمانوں پر تھی۔ اس لئے کہ اوّلاً: پاکستان کے موجودہ صوبوں میں سے وہ واحد صوبہ جس میں قبل از تقسیم ہند مسلم لیگ کی حکومت قائم تھی سندھ ہی تھا۔ ثانیاً سندھ ہی وہ واحد

صوبہ ہے جو اپنی پوری صحیح و سالم صوبائی حدود اور ایک ایسے مکمل کلچرل یونٹ کی حیثیت سے پاکستان میں شامل ہوا جس کے لئے ملکی حدود سے باہر کوئی لسانی یا ثقافتی کشش (P.LL) موجود نہ تھی۔ اس کے مقابلے میں پنجاب تقسیم کے دردناک صدمے سے دوچار ہوا، اور سرحد اور بلوچستان کے لئے زبان و قومیت کی زوردار کشش بیرونِ پاکستان موجود تھی، ثالثاً: پاکستان کے موجودہ صوبوں میں سے وہ واحد صوبہ بھی سندھ ہی تھا جہاں کے مسلمانوں کو ہندوؤں کی ذہنیت کا کسی قدر اندازہ تھا۔ اس لئے کہ سرحد اور بلوچستان میں تو سرے سے ہندو مسلم مسئلہ موجود ہی نہیں تھا۔ پنجاب میں اُن عوامل کی بنا پر جن پر تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے انگریز نے مسلمانوں کو دبانے کی بجائے کسی نہ کسی درجے میں سہارا دیا اور اُن کی حوصلہ افزائی کی لہٰذا ہندو اُن کا زیادہ استحصال نہیں کر سکے جبکہ سندھ میں اُن اسباب کی بنا پر جن کا پہلے تذکرہ ہو چکا ہے، انگریز نے بقیہ پورے ہندوستان اور بالخصوص بنگال کی طرح مسلمانوں کو شدت کے ساتھ دبایا اور اُن کے مقابلے میں ہندوؤں کی باقاعدہ سرپرستی کی۔ لہٰذا ہندوؤں کے ساہوکارانہ ہتھکنڈوں کا تلخ تجربہ سندھی مسلمانوں کو تھا اور اس اعتبار سے اُنہیں 'مہاجرین' کے ساتھ ایک گونہ مشابہت حاصل تھی ــــ رابعاً: یہ کہ تاریخی اعتبار سے یہ شرف تو پورے برِ عظیم ہندو پاک میں صرف سندھ ہی کو حاصل ہے کہ اِسلام کی قدیم ترین اور خالص عربی الاصل روایات نے وہاں گہری جڑیں جمائیں اور اگرچہ یہ سلسلہ مغربی پنجاب کے بھی ایک بہت بڑے حصے تک پھیل گیا تھا لیکن " الاقدم فالاقدم " کے اصول کے مطابق اس سلسلے میں فیصلہ کن فضیلت سندھ کو حاصل ہے ــــ مزید برآں سندھ طویل ترین عرصے تک اسلامی علوم کا عظیم گہوارہ بنا رہا۔ چنانچہ ابتدائی دور میں یہ شرف زیادہ تر سندھ کے زیریں علاقے خصوصاً ٹھٹھہ شہر کو حاصل رہا جس میں ایک قدیم سفرنامے کی روایت کے مطابق ایک دور میں تین صد دارالعلوم قائم تھے! بعد کے زمانے میں اَپر سندھ نے اس ضمن میں زیادہ اہمیّت حاصل کر لی جہاں بڑے بڑے دینی و روحانی مراکز قائم رہے۔ چنانچہ قصبہ گھوٹکی نے شیخ محمد حیات سندھیؒ ایسا عظیم محدث پیدا کیا جس کے شاگردوں میں بارہویں صدی ہجری کے دو مجدد محمد ابن عبدالوہاب نجدیؒ اور شاہ ولی اللہ دہلویؒ ایسی عظیم شخصیتیں شامل ہیں۔ بعد ازاں تحریک ولی اللٰہی کا بھی

بہت بڑا مرکز سندھ بنا ـــــ نتیجتہً اس کے زیرِ اثر اُٹھنے والی عظیم تحریکِ شہیدینؒ کے قافلے کی سندھ میں رانی پور اور پیر جو گوٹھ کے دینی و روحانی مراکز میں شایانِ شان پذیرائی بھی ہوئی اور پنجاب اور سرحد کو سکھوں کے تسلط سے نجات دلانے کے لیے یہ تقسیمِ کار بھی طے ہوئی کہ مجاہدینؒ کا قافلہ بلوچستان اور افغانستان ہوتا ہوا شمال مغربی جانب سے سکھوں پر حملہ کرے ـــــ اور سندھی مجاہدینؒ بہاولپور اور ڈیرہ غازی خان سے ہوتے ہوئے سکھوں کی سلطنت پر جنوب مغرب سے حملہ آور ہوں، ـــــ یہ دوسری بات ہے کہ کچھ خوانینِ سرحد کی غداری اور کچھ اپنی تدبیری غلطیوں کے باعث یہ جہاد پہلے ہی مرحلے میں دنیوی اعتبار سے ناکام ہو گیا اگرچہ مجاہدینؒ نے جامِ شہادت کی صورت میں وہ سب سے بڑی کامیابی حاصل کر لی جس سے بڑی کامیابی کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا ـــــ پھر یہ تو اسی صدی کا واقعہ ہے کہ حکمتِ ولی اللّٰہی کا وہ عظیم شارح جس نے پنجاب کے ایک سکھ خاندان میں آنکھ کھولی تھی مشرف بہ اسلام ہو کر سندھ پہنچا تو اُسے وہاں کی فضا ایسی پسند آئی کہ وہیں کا ہو رہا اور اب دنیا اُسے جانتی ہی مولانا سندھیؒ کے نام سے ہے۔ ہماری مراد مولانا عبید اللہ سندھیؒ سے ہے۔

الغرض ؎ " جن کے رُتبے ہیں سوا اُن کی سوا مشکل ہے! " کا اصول مہاجرین کی طرح قدیم سندھی مسلمانوں پر منطبق ہوتا ہے ـــــ اور اگر اس شاندار ماضی کے حامل صوبے میں دین و شریعت کا استہزا ہو، اسلامی اقدار و شعائر کا مذاق اُڑے، لسانی و صوبائی عصبیت دینی و اسلامی عصبیت سے بالاتر ہو جائے، ملّی وحدت پارہ پارہ ہو جائے اور اس کی جگہ زبان اور کلچر کے نام پر ہندوؤں کے ساتھ متحدہ قومیت کا پرچار ہو ـــــ یا خالص مادّی نظریات کو فروغ حاصل ہو اور نوجوانوں میں مارکس ازم اور کمیونزم جنگل کی آگ کی طرح پھیل رہے ہوں، اور دین دار عناصر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں اور علماءِ کرام نہ صرف یہ کہ قال اللہ اور قال الرّسولؐ ہی میں منہمک رہیں، بلکہ اپنی سادہ لوحی سے دشمنِ دین و ملت عناصر کی تقویت کا باعث بن جائیں تو جو ہلکی سے ہلکی بات کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ جب آگ اور خون کا طوفان آئے گا تو قدیم سندھی مسلمان اور اُن کے دین دار عناصر بھی نہیں بچ

سکیں گے۔ اور اگر خدانخواستہ پاکستان کو کچھ ہو گیا تو اس کی ذمہ داری مہاجرین کے بعد سب سے زیادہ قدیم سندھی مسلمانوں ہی پر عائد ہوگی۔

اس کے برعکس اگر بقول "کبھی بھولی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو!" کے مصداق مہاجرین بھی ہوش میں آجائیں اور قدیم سندھی مسلمان بھی ___ اور بقول "اپنی خودی پہچان! او غافل افغان!" کے مطابق انہیں اپنے اصل مرتبہ و مقام کا شعور اور اپنی خصوصی و اضافی ذمہ داری کا احساس ہو جائے اور بقول "معمارِ حرم باز بہ تعمیرِ جہاں خیز!" کے مطابق احیاءِ اسلام اور اقامتِ دین کی جدّوجہد کے لئے کمر کس لیں تو جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، اِن شاء اللہ العزیز وہ "كَانُوْٓا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا" کا مصداق بن سکتے ہیں! ___ بہرحال راقم الحروف صرف اپنے امکانی حد تک حقِ نصح و اخلاص ہی ادا کر سکتا ہے، بمصداقِ الفاظِ قرآنی: اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ " ___ (سورۂ ہود، آیت ۸۸) ترجمہ: میں تو صرف اصلاح ہی کا طلب گار ہوں جس قدر بھی میرے امکان میں ہو اور مجھے توفیق تو اللہ کے سہارے ہی مل سکتی ہے!") ___ رہا فیصلہ تو وہ نئے اور پرانے سندھیوں کے ہاتھ میں ہے۔ بقول اقبال ؎ فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے، دل یا شکم!" البتہ راقم الحروف کے نزدیک ایک بات بالکل یقینی ہے کہ "اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ" (سورۃ انبیاء، آیت ۱، ترجمہ: "لوگوں کے حساب کی گھڑی آن پہنچی ہے۔ لیکن وہ غفلت ہی میں پڑے اعراض کر رہے ہیں") کے مصداق فیصلہ کن وقت آن پہنچا ہے اور مہلت بہت کم ہے۔

اس کا یہ مطلب ہرگز نہ سمجھا جائے کہ راقم کے نزدیک پنجاب، سرحد اور بلوچستان کی نہ کوئی ذمہ داری اور مسئولیت ہے نہ کوئی قصور یا کوتاہی، اُن کے بارے میں گفتگو ان شاء اللہ پھر کبھی ہوگی اس لئے کہ اس وقت ایک تو اصلاً مسئلہ سندھ زیرِ بحث ہے۔ دوسرے یہ حقیقت واقعتہً ناقابلِ تردید ہے کہ پاکستان کے خیر یا شر کی ذمہ داری کا بوجھ بقیہ تینوں صوبوں

کے مقابلے میں نئے اور پرانے سندھیوں پر کہیں زیادہ ہے ـــــ ورنہ جیسے "خورشیدِ درخشاں" کے مقابلے میں "ذرّۂ فانی" انتہائی حقیر اور ناچیز ہے لیکن اپنی جگہ خود "ذرّۂ فانی" اتنی عظمت کا حامل ہے کہ ؎ "لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں!" بالکل اسی طرح پاکستان کے بناؤ اور بگاڑ میں ایک جانب 'بڑے بھائی' کی حیثیت سے اور دوسری جانب اس بناء پر کہ اس صدی کے عظیم ترین اسلامی مفکّر، قافلۂ ملّی کے سب سے بڑے حُدی خواں اور پاکستان کے مصوّر و مجوّز علّامہ اقبال کا تعلق پنجاب سے تھا پنجاب کی ذمّہ داری بہت بڑھ جاتی ہے، اِسی طرح اس اعتبار سے کہ صوبۂ سرحد تقریباً صد فی صد مسلمانوں ہی کی آبادی پر مشتمل ہے اور وہاں کے عوامی کلچر میں مذہب رَچا بسا ہوا ہے اور خاص طور پر اس پہلو سے کہ اس کے ذمّے تحریکِ شہیدینؒ کا قرض بھی واجب الادا ہے۔ سرحد کے مسلمانوں کے شانوں پر بھی عظیم ذمّہ داری کا بوجھ ہے۔

مہاجر بھائیوں کو میں نے خود احتسابی کی جو ذرا سی دعوت دی تھی اس پر میرے لئے غیظ و غضب کے اظہار کے ساتھ ساتھ یہ سوال بھی اٹھایا گیا کہ یہ شخص خود کیا ہے؟ مہاجر یا مقامی؛ اور پنجابی یا ہندوستانی؟ اس کے جواب میں اوّلاً تو پنجاب کے ایک درویش سائیں بُلّھے شاہ کا یہ عارفانہ مصرعہ پیشِ خدمت ہے کہ:

؎ "بُلّھیا! کیہ جاناں میں کون!"

یعنی "اے بُلّھے شاہ! مجھے کیا معلوم کہ مَیں (حقیقت میں) کون (یا کیا) ہوں!" اور پھر عرض ہے کہ راقم پنجابی بھی ہے اور ہندوستانی بھی، اس لئے کہ اُس کی پیدائش بھی پنجاب کے ضلع حصار میں ہوئی تھی جو اب بھارت کے ہریانہ سٹیٹ میں شامل ہے اور وہیں اس کی زندگی کے ابتدائی پندرہ سال گزرے تھے اور اس کے بعد کے چالیس سال کا اکثر و بیشتر حصّہ تو پنجاب کے دل اور شہرِ اقبال لاہور میں بسر ہوا ہے لیکن اس کا خاندان (ننھیال اور ددھیال دونوں) کا تعلق یوپی کے ضلع مظفر نگر سے ہے جہاں سے راقم کے پردادا حافظ

شیخ نور اللہ مرحوم و مغفور کو ۱۸۵۷ء میں زیرِ عتاب آنے کے باعث نقلِ مکانی کرنی پڑی تھی
— رہا مقامی اور مہاجر کا معاملہ تو اوّلاً تو راقم اِس پوری دنیا میں کسی انسان کو مقامی سمجھتا ہی نہیں یہاں تو سب مہاجر ہیں۔ اس لئے کہ ہمارا اصل گھر تو ' دَارُالْخُلْد ' ہے جہاں سے ہمارا جبری انخلاء ہوا تھا — اور اب ہمارے " جہادِ زندگانی " کا اصل مقصد اپنے اصل ' مقام ' کی بازیافت کے سوا کچھ نہیں! مزید برآں اگر اُس حدیثِ نبویؐ کو پیشِ نظر رکھا جائے جس کی رُو سے اس سوال کے جواب میں کہ " اَیُّ الْھِجْرَۃِ اَفْضَلُ یَارَسُوْلَ اللّٰہ " (یعنی " اے اللہ کے رسولؐ! سب سے افضل ہجرت کونسی ہے! ") نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا تھا کہ " اَنْ تَھْجُرَ مَا کَرِہَ رَبُّکَ " (یعنی یہ کہ تم ہر اس چیز کو ترک کر دو جو اللہ کو ناپسند ہے)، تو کم از کم ہر صاحبِ ایمان تو ہر دَم حالتِ ہجرت ہی میں ہوتا ہے — تاہم اگر مہاجر کے پاکستان میں مروجہ مفہوم کو پیشِ نظر رکھا جائے تو بھی راقم لاکھوں ہی نہیں کروڑوں مہاجروں سے زیادہ ' مہاجر ' ہے۔ اس لئے کہ وہ ہندوستان سے پاکستان استعارے یا محاورے کے طور پر نہیں حقیقتاً اور واقعۃً " آگ اور خون کے دریا عبور کر کے آیا تھا اور اُس نے اپنے خاندان کے ساتھ حصار سے سلیمانکی ہیڈ ورکس تک ایک سو ستّر میل کا فاصلہ ایک پیدل قافلے کے ساتھ بیس دنوں میں طے کیا تھا اور لگ بھگ ایک ماہ تک حصار میں محصوری اور پھر اُس پُرخطر اور جاں گسل سفر کے دوران جس میں ہر وقت موت زندگی سے قریب تر محسوس ہوتی تھی، ایسے ایسے مصائب جھیلے اور سختیاں برداشت کیں جن کا اُن لوگوں کو تصوّر تک نہیں ہو سکتا جو آج پاکستان میں ' مہاجر کاز کے چیمپئن ' بن گئے ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی عرض کر دیا جائے تو نامناسب نہ ہوگا کہ راقم کو لاہور اور پنجاب کی فضاؤں سے تو پیار ہے ہی اس لئے کہ اُن میں اس کی زندگی کے پورے چالیس سال گزرے ہیں، اور یہیں اس کا گھر بار بھی ہے اور اُس کے تمام بہن بھائی بھی آباد ہیں۔ اور کُل کی کُل اولاد بھی — مزید برآں یہیں اس کی بیس برس کی محنتِ شاقہ کا ایک محسوس و مشہود نتیجہ بھی ' قرآن اکیڈمی ' کی صورت میں موجود ہے — لیکن واقعہ یہ ہے کہ کراچی بھی اُسے اپنا گھر ہی معلوم ہوتا ہے، — جہاں اُس کے بے شمار اعزّہ و اقارب بھی آباد

ہیں اور ایک بہت بڑی تعداد ایسے لوگوں کی بھی موجود ہے جو اسلامی انقلاب کی جدّوجہد کے لیئے ابتدائی سرمایہ (STARTING CAPITAL) کا کام دے سکیں ـــ پھر جب راقم کو سرحد کے اندرونی علاقوں میں جانے کا اتفاق ہوا تو اُسے پٹھانوں کی سادہ معاشرت میں بڑی کشش محسوس ہوئی اور اُن کی غیرت وحمیت پر رشک آیا۔ اور گذشتہ سال جب سندھ کے بعض اندرونی علاقوں میں جانے کا اتفاق ہوا تو واقعہ یہ ہے کہ اُس نے بالکل ایسے محسوس کیا کہ ؎ "آئی صدا لئے جبرئیل تیرا مقام ہے یہی!"

مزید برآں جب چند سال قبل اوّلاً دہلی اور علی گڑھ اور پھر دارالعلوم دیوبند کے صد سالہ جشن کے موقع پر یوپی کے دوآبے (ضلع مظفر نگر اور سہارن پور) میں جانا ہُوا تو وہاں کی فضا بھی بہت مانوس لگی تھی اور بالکل ایسے محسوس ہوا تھا کہ "جا ایں جاست!" اور دوبار حیدر آباد دکن جانا ہوا تو وہاں کے لوگوں کے خلوص ومحبت اور دینی غیرت وحمیت کی بنا پر دل نے یہ محسوس کیا تھا کہ جیسے یہی اصلی وطن ہے! ـــ اور یہ کہنے کی تو کوئی ضرورت ہی نہیں ہے کہ جب حرمین شریفین کی جانب محوِ سفر ہوتا ہوں تو کیفیت بالکل وہی ہوتی ہے جو علامہ اقبال نے اپنے ان اشعار میں بیان فرمائی ہے کہ:

باایں پیری رہِ یثرب گرفتم ـــ نوا خواں از سرور عاشقانہ
چوں آں مرغے کہ در صحرا سرِ شام ـــ کشاید پر بہ فکرِ آشیانہ

گویا راقم کی کیفیت اپنے فکری مرشد کے اس شعر کے بالکل مطابق ہے کہ ؎

چین وعرب ہمارا ہندوستاں ہمارا ـــ مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

علاوہ ازیں ریکارڈ کی تکمیل کے لئے یہ بھی عرض کر دیا جائے تو کوئی حرج نہیں ہے کہ یوپی کے مذکورہ بالا دوآبے میں 'شیوخ' کی ایک وسیع وعریض برادری رہائش پذیر تھی جن میں عرب سے آئے ہوئے قرشی النسل لوگ اور مقامی آبادی کے نومسلم باہمی رشتوں میں بندھے اور بندھے ہوئے تھے، قرشیوں میں غالباً صدیقی سب سے زیادہ تھے، پھر عثمانی اور پھر فاروقی ـــ چنانچہ راقم الحروف کی والدہ صدیقی ہیں اور شیخ خیان مینی کی اولاد سے ہیں، حتکہ والد صاحب مرحوم ومغفور کے قول کے مطابق راقم کا ددھیال ہندی الاصل نومسلموں پر

مشتمل ہے اور ہم نسلاً "اگروال" ہیں جن کے بارے میں عام طور پر تو یہ مشہور ہے کہ یہ بنیوں کی گوت ہے لیکن مولانا عبدالقدوس ہاشمی مدظلہ، ایسے عالم محقق کی رائے ہے کہ یہ اصلاً برہمن تھے لیکن انہیں کسی موقع پر کسی سبب سے برہمنوں نے "ذات باہر" کر دیا تھا۔ راقم الحروف کو بھی یہی رائے زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے' اس لئے کہ میرے ددھیالی خاندان میں کاروبار یا دکانداری کا معاملہ دُور دُور تک نظر نہیں آتا اور ہمارے بزرگوں کا مشغلہ جہاں تک معلومات کام کرتی ہیں درس و تدریس و تعلیم اور تعلّم ہی تھا! ــــ گویا اس اعتبار سے بھی راقم کو اُس "کافرِ ہندی" سے ایک گونہ نسبت حاصل ہے جس نے "ایک فلسفہ زدہ سیّد زادے" سے مخاطب ہو کر کہا تھا:

میں اصل کا خاص سومناتی! آبا مرے لاتی و مناتی
تو سیّدِ ہاشمی کی اولاد میری کفِ خاک برہمن زاد

اور اگر یہ اطلاع نہ ملی ہوتی کہ جناب جی۔ ایم۔ سیّد نے اپنی ایک حالیہ تصنیف میں اپنے ہاشمی ہونے سے انکار کیا ہے تو راقم اقبالؔ کے مندرجہ بالا اشعار کو خود اُن کے مزید دو اشعار اور خاقانی کے دو شعروں کے ساتھ اُن کی خدمت میں پیش کرتا ؎

تو اپنی خودی اگر نہ کھوتا زنّاریِ برگساں نہ ہوتا
شعلہ ہے ترے جنوں کا بے سوز سُن لے مجھ سے یہ نکتۂ دل افروز

"دِل در سخنِ محمدّی بند اے پورِ علیؓ ز بوعلی چند!
چوں دیدۂ راہ بیں نہ داری قائدِ قرشی بہ از بخاری!"

مستقل علاج اور فوری تدابیر

ہمارے قومی و ملّی عوارض کے اصل سبب کے مُعیّن ہو جانے کے بعد اس کے مستقل حل اور دائمی علاج کا تعین بھی خود بخود ہو جاتا ہے ـــــ یعنی بمصداق "علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی!" ایک ایسا کامل، ہمہ گیر اور ہمہ جہتی اسلامی انقلاب جو ذہنیتوں اور نیتوں کی تصحیح اور انفرادی اخلاق و اعمال کی اصلاح کے علاوہ دینِ حق کے اُس کامل نظامِ عدل و قسط کو بالفعل قائم و نافذ کر دے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو نبی خاتم اور رسولِ کامل صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے عطا فرمایا ہے۔

گویا 'استحکامِ پاکستان' میں ہم مجموعی حیثیت سے قیامِ پاکستان کے تاریخی پس منظر اور اس کے محرکات و عوامل کے تجزیئے اور اس کے بقاء و استحکام کے تقاضوں کے تفصیلی جائزے کے بعد جس نتیجے تک پہنچے تھے، صوبۂ سندھ کے مخصوص مسائل و معاملات پر تفصیلی بحث کا حاصل بھی وہی ہے۔ لہٰذا 'استحکامِ پاکستان' کے آخر میں راقم نے "پاکستان کے بقاء و استحکام کے لوازم" کے عنوان سے جو کچھ عرض کیا تھا مناسب ہے کہ اُسے اُن ہی الفاظ میں دُہرا دیا جائے:

> "اس پس منظر میں ہر صاحبِ فہم و شعور انسان لامحالہ اسی نتیجے تک پہنچے گا کہ ملک و ملّت کے استحکام ہی نہیں بقا تک کے لئے حسبِ ذیل چیزیں ناگزیر اور لازمی ہیں:
>
> (۱) ایک ایسا طاقتور انسانی جذبہ جو جُملہ حیوانی جبلتوں پر غالب آجائے اور قوم

کے افراد میں کسی مقصد کے لئے تن من دھن لگا دینے حتٰی کہ جان تک قربان کر دینے کا مضبوط ارادہ اور قومی داعیہ پیدا کر دے۔

(۲) ایک ایسا ہمہ گیر نظریہ جو افرادِ قوم کو ایک ایسے مضبوط ذہنی و فکری رشتے میں منسلک کر کے بُنیانِ مرصوص بنا دے جو رنگ، نسل، زبان اور زمین کے تمام رشتوں پر حاوی ہو جائے اور اس طرح قومی یک جہتی اور ہم آہنگی کا ضامن بن جائے!

(۳) عام انسانی سطح پر اخلاق کی تعمیرِ نو جو صداقت، امانت، دیانت اور ایفاءِ عہد کی اساسات کو اَز سرِ نَو مضبوط کر دے اور قومی و ملی زندگی کو رشوت، خیانت، ملاوٹ، جھوٹ، فریب، ناانصافی، جانبداری، ناجائز اقربا پروری اور وعدہ خلافی ایسی تباہ کن بیماریوں سے پاک کر دے۔

(۴) ایک ایسا نظامِ عدلِ اجتماعی (SYSTEM OF SOCIAL JUSTICE) جو مرد اور عورت، فرد اور ریاست، اور سرمایہ اور محنت کے مابین عدل و اعتدال اور قسط و انصاف اور فی الجملہ حقوق و فرائض کا صحیح و حسین توازن پیدا کر دے!

تحریکِ پاکستان کے تاریخی اور واقعاتی پس منظر، اور پاکستان میں بسنے والوں کی عظیم اکثریت کی فکری و جذباتی ساخت، دونوں کے اعتبار سے یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ اِس ملک میں یہ تمام تقاضے صرف اور صرف دین و مذہب کے ذریعے اور اسلام کے حوالے اور ناطے سے پورے کئے جا سکتے ہیں۔ کیونکہ، جیسے کہ ہم ناقابلِ تردید دلائل اور شواہد سے ثابت کر چکے ہیں، علامہ اقبال مرحوم کے حسبِ ذیل اشعار خواہ اس وقت دنیا کی کسی دوسری مسلمان قوم پر پورے طور پر صادق نہ آتے ہوں، ملّتِ اسلامیہ پاکستان کے ضمن میں صدفی صد درست اور کمالِ صداقت و حقّانیت کے مظہر ہیں کہ:

اپنی ملّت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی ؐ

اُن کی جمعیّت کا ہے ملک و نسب پر انحصار　　قوّتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت ترا
دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں　　اور جمعیت ہوئی رُخصت تو ملّت بھی گئی

لہٰذا ہم اُن تمام لوگوں کو جو پاکستان کی بقا اور سالمیت کے دل سے خواہشمند ہوں، دعوت دیتے ہیں کہ پوری دیانت داری کے ساتھ امکانی حد تک غور کریں کہ آیا متذکرہ بالا پانچ اُمور پاکستان کی سالمیت اور استحکام کے لوازم ہیں یا نہیں ؟ اور آیا اُن میں سے کوئی ایک تقاضا بھی اسلام کے سوا کسی اور نظریئے یا نظام کے حوالے سے پُورا ہونے کا کوئی امکان ہے ؟!! "

چنانچہ ' استحکام پاکستان ' کا اختتام ان الفاظ پر ہوا تھا کہ :

" ہماری اب تک کی کُل گذارشات کا لُبِّ لباب اور حاصلِ کلام صرف یہ ایک جُملہ ہے کہ :

" پاکستان کے استحکام کا واحد ذریعہ اسلامی انقلاب ہے ! "

اور اسی پر ہم اِس کتاب کو ختم کر رہے ہیں ۔

اس مرحلے پر ایک نہایت اہم اور بنیادی سوال یہ سامنے آتا ہے کہ وہ اسلامی انقلاب کیسے آئے گا ؟ اُس کے اساسی لوازم کیا ہیں ؟ بنیادی طریق کار کیا ہے ؟ ابتدائی مراحل کیا ہیں ؟ اور تکمیلی اقدامات کیا ہوں گے ؟ بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اُن اُمور کی بھی تفصیلی وضاحت کی ضرورت ہے کہ اسلامی انقلاب سے مراد کیا ہے ؟ اور اس کے نتیجے میں جو سماجی، معاشی اور سیاسی نظام وجود میں آئے گا اس کے اہم خد و خال کیا ہوں گے ؟

چنانچہ " پاکستان میں اسلامی انقلاب : کیا اور کیسے ؟ " کے موضوع پر راقم الحروف ان شاء اللہ جلد ہی اپنی دوسری تالیف کا آغاز کر دے گا۔

وَمَا تَوفِیقِی اِلَّا بِاللّٰہِ العَلِیِّ العَظِیم !! "

راقم کی یہ تحریر ۱۷ فروری ۸۶ء کی ہے اور ان سطور کی تحریر کے وقت اس پر پورے سوا دس ماہ گذر چکے ہیں ۔ اور اصل موضوع پر گفتگو کا تاحال آغاز بھی نہیں ہوا۔ راقم اس

تاخیر پر نادم بھی ہے اور معذرت خواہ بھی، لیکن بقول " ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا!" کے مصداق یہ تاخیر ویسے بھی بلا سبب نہ تھی اور خاص طور پر اس کے دوران 'مسئلہ سندھ' پر جو تفصیلی گفتگو ہو گئی وہ نہایت اہم بھی ہے اور 'استحکامِ پاکستان' سے براہِ راست متعلق بھی! تاہم اِن شاء اللہ العزیز اب بلا تاخیر براہِ راست اصل موضوع پر گفتگو کا آغاز ہو جائے گا۔ لیکن اس سے قبل، اس طویل 'جملہ معترضہ' کے آخری جزو کی حیثیت سے، آج کی صحبت میں پاکستان کے بقا کے بعض فوری اور لازمی تقاضوں کی جانب اشارہ مطلوب ہے!

اس سلسلے میں پہلے دو باتیں بطور تمہید ذہن نشین کرنی ضروری ہیں:

ایک یہ کہ جیسے افراد کے جسمانی امراض کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ اصل مرض اور اس کی ظاہری علامات بھی دو مختلف چیزیں ہیں، اور بنیادی بیماری اور ثانوی پیچیدگیوں کی بھی علیحدہ علیحدہ تشخیص و تعیین ضروری ہوتی ہے ـــــ اور بسا اوقات مرض کی بحرانی کیفیت یا مریض کی شدید تکلیف کے پیشِ نظر مرض کی تشخیص سے پہلے علامات و شکایات کے ازالے اور اصل مرض کے علاج سے قبل ثانوی پیچیدگیوں سے نبرد آزمائی ضروری ہو جاتی ہے ـــــ اسی طرح قوموں اور معاشروں کے اجتماعی عوارض کے ضمن میں بھی مستقل علاج کی فکر کے ساتھ ساتھ بحرانی کیفیات سے فوری طور پر نمٹنا ضروری ہوتا ہے اور اُن سے کُلّی صرفِ نظر " تا تریاق از عراق آوردہ شود مار گزیدہ مُردہ شود" کے مطابق نہایت خطرناک نتائج پیدا کر سکتا ہے۔

دوسرے یہ کہ اگرچہ بقول " تصوّر ملکوتی و جذبہ ہائے بلند!" کے مصداق 'تصوّر پسندی' (IDRALISM) مفید اور مطلوب شے ہے، لیکن ایسی نِری نظری تصوّریت جس کے ساتھ متناسب اور ہم وزن 'واقعیت پسندی' (REALISM) موجود نہ ہو نہایت مہلک نتائج پیدا کر سکتی ہے اور جہاں بقول " منزلِ ما کبریاست!" کے مصداق مطلوب و مقصود اعلیٰ سے اعلیٰ اور نصب العین بلند سے بلند تر معیّن کرنا ضروری ہے وہاں حقائق و واقعات کو بالکل نظر انداز کر دینا بھی سخت عاقبت نااندیشی ہے۔

۔۔۔ چنانچہ ایسے لیڈر، اور رہنما جو قوم کو ہواؤں ہی میں اڑائیں اور فضاؤں ہی کی سیر کرائیں لیکن نہ زمین پر قدم بقدم چلنا سکھائیں نہ " طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ " یعنی درجہ بدرجہ ترقی کے لئے محنت و مشقت کا عادی بنائیں وہ بالآخر قوم کو ایسے مقام پر پہنچا دیتے ہیں جہاں وہ لامحالہ ع " جب آنکھ کھلی گُل کی تو موسم تھا خزاں کا! " کی کیفیت سے دوچار ہو کر رہتی ہے!

الحمدللہ کہ پاکستان کا ہر باشعور شہری اس حقیقت سے واقف ہے کہ راقم کے نزدیک پاکستان کے جملہ قومی و ملی عوارض کا اصل علاج اور ہمارے تمام مسائل کا مستقل حل بھی ایک مکمل اسلامی انقلاب کے سوا اور کوئی نہیں ۔۔۔ اور وہی از روئے دین و ایمان اس دنیا میں ہماری جدّ و جہد کا آخری مطلوب اور ہمارے سفرِ حیات کی منزلِ مقصود بھی ہے ۔۔۔ لیکن ع " یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات " کے مصداق جس بات کو عام لوگ ہی نہیں میرے بعض احباب اور بہی خواہ بھی سمجھنے سے قاصر رہ جاتے ہیں وہ یہ ہے کہ میرے نزدیک پاکستان کے موجودہ بحرانی حالات کے پیشِ نظر اس کی بقا کے لئے بعض فوری دستوری و سیاسی اقدامات بھی اتنے ہی اہم اور ناگزیر ہیں اور اگر ان سے اعراض کیا گیا یا ان کے ضمن میں مسلسل تاخیر و تعویق سے کام لیا جاتا رہا تو شدید اندیشہ ہے کہ مستقبل قریب میں پاکستان کے مزید حصے بخرے ہونے (BALKANISATION) کے عمل کو روکنا ناممکن ہو جائے گا۔

اس سلسلے میں ایک مشورہ راقم نے صدرِ مملکت جنرل محمد ضیاء الحق صاحب کی خدمت میں اپنے ۲ دسمبر ۸۲ء والے خط میں بھی پیش کیا تھا جس کے ضمن میں تمہیداً عرض کیا تھا:

" مجھے یقین ہے کہ آپ اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ میں معروف اور مروّجہ معنی میں ہرگز سیاسی آدمی نہیں اور میرے بیشتر اوقات اور تمام تر مساعی مستقبل کے اسلامی انقلاب کے لئے میدان ہموار کرنے کی غرض سے دعوتی و تبلیغی اور تعلیمی و تدریسی سرگرمیوں کے لئے وقف ہیں .... ساتھ ہی مجھے اس امر کا بھی یقین ہے کہ یہ حقیقت بھی آپ کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو سکتی کہ کوئی باشعور مسلمان خالص غیر سیاسی نہیں ہو سکتا۔ بایں معنی کہ وہ ملک و ملت کے حالات سے قطعاً بے خبر

یا لاتعلق رہے اور قوم و وطن کی صلاح و فلاح یا ان کو درپیش خطرات و خدشات کے بارے میں سوچ بچار اور غور و فکر سے بھی کام نہ لے۔

چنانچہ میں بھی اِس ضمن میں اپنی امکانی حد تک حالات کا مشاہدہ بھی کھلی آنکھوں سے کرتا ہوں اور دوسروں سے تبادلۂ خیال بھی کھلے قلب و ذہن کے ساتھ کرتا ہوں (اور اس سلسلے میں مجھے اپنے اُن دَوروں اور سفروں سے بھی مدد ملتی ہے جو مجھے اپنی دعوتی و تبلیغی مساعی کے ضمن میں اندرونِ ملک یا بیرونِ وطن کرنے پڑتے ہیں) ـــــ اور پھر خود غور و فکر بھی کرتا ہوں اور اس کے نتیجے میں جو رائے بھی میری بنے، میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اس کے مطابق مشورہ پورے نصح و خیر خواہی کے جذبے کے ساتھ عوام کو بھی دوں اور ان کو بھی جن کے ہاتھوں میں ملک و قوم کی زمامِ کار ہے۔ از روئے فرمانِ نبوی: " اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃُ " یعنی " دین تو نام ہی نصح و اخلاص اور خیر خواہی اور وفاداری کا ہے "۔ اور جب پوچھا گیا: " لِمَنْ یَا رسول اللّٰہ ! " یعنی " حضورؐ کس کے ساتھ؟ " تو ارشاد ہوا: " لِلّٰہِ وَلِکِتَابِہٖ وَلِرَسُوْلِہٖ وَلِاَئِمَّۃِ المسلمین وَعَامَّتِھِمْ " یعنی " اللہ اور اس کی کتاب اور اس کے رسولؐ کے ساتھ اخلاص و وفاداری اور مسلمانوں کے اولی الامر اور عوام دونوں کے ساتھ نصح و خیر خواہی۔ "

فوری تدابیر

ملک و ملت کے ساتھ اسی نصح و اخلاص اور وفاداری و خیر خواہی سے بدرجۂ مجبور ہو کر، اُن حضرات سے معذرت کے ساتھ جو مجھے سیاسی و دستوری مسائل میں رائے دینے کا اہل یا حقدار ہی نہیں سمجھتے یا اسے میری دینی سرگرمیوں اور مذہبی مشاغل کے منافی گردانتے ہیں، آج پھر قوم کے عوام اور اس کے سربرآوردہ لوگوں کی خدمت میں چند گزارشات پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔

راقم کے نزدیک قوم اور ملک کی کشتی کو موجودہ خوفناک بھنور سے نکالنے کے لئے

جو فوری اقدامات لازمی و لابدی ہیں اُن کا اصل الاصول تو یہ ہے کہ عوام کو اُن کے سیاسی حقوق فی الفور لوٹا دیئے جائیں اور اس سلسلے میں جو ظاہری خطرات و خدشات نظر آتے ہیں اُن سے بالکل خائف نہ ہوا جائے۔ اس لئے کہ بصورتِ دیگر جو اندیشے ملک و ملت کے مستقبل کو لاحق ہیں وہ اُن سے کئی گنا زیادہ خوفناک ہیں! ــــــ اور دوسرا رہنما اصول یہ ہے کہ اس حقیقتِ واقعی کو تسلیم کرتے ہوئے کہ اِس وقت پاکستان میں مسلم قومیت کا جذبہ بہت کمزور پڑ چکا ہے اور اس کی جگہ نسلی، لسانی اور علاقائی عصبیتوں نے لے لی ہے، ملکی دستور میں علاقائی زبانوں اور ثقافتوں کے مناسب تحفظ کی ضمانت دی جائے۔

فوری اقدام ممکن ہے

اس سلسلے میں اوّلاً اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ اگرچہ ہمارے ملک میں حق تلفی اور ناانصافی صرف سیاسی سطح پر ہی نہیں ہے بلکہ سماجی اور معاشی سطح پر بھی ظلم و استحصال کا دور دورہ ہے لیکن سماجی و معاشرتی اصلاح کے لئے بنیادی ذہنی و نفسیاتی تبدیلی لازمی ہوتی ہے اس لئے کہ معاشرتی اقدار کا گہرا تعلق فلسفہ حیات سے ہوتا ہے اور جب تک اس میں بنیادی تبدیلی نہ آئے، ذات پات کی تفریق، اونچ نیچ کی تقسیم، اعلیٰ و ادنیٰ کے معیارات، سماجی رسومات اور بحیثیت مجموعی طرزِ معاشرت میں تبدیلی ممکن نہیں ہوتی ــــــ اسی طرح معاشی نظام کی تبدیلی بھی ایک کُلّی اور ہمہ گیر انقلاب کے بغیر ممکن نہیں، اس لئے کہ استحصالی طبقات آسانی کے ساتھ اپنے ناجائز مفادات سے دست بردار ہونے کے لئے تیار نہیں ہوتے اور ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں کہ کوئی ایسی تبدیلی نہ آنے پائے جس سے ان کے مفادات پر آنچ آ سکتی ہو ــــــ ان کے مقابلہ میں سیاسی عدل و مساوات کے قیام اور جمہوری حقوق کی بحالی کے لئے کوئی ذہنی و فکری انقلاب بھی لازمی نہیں ہے، اس لئے کہ یہ عین اس مروّجِ عصر (SIPIRIT OF THE AGE) کے مطابق ہے جو اس وقت پوری دنیا میں جاری و ساری ہے اور نہ انقلابی تصادم بھی ناگزیر

نہیں ہے اس لئے کہ کم از کم نظری طور پر اس کے ضمن میں کوئی اختلاف موجود نہیں ہے لہٰذا اس میں کسی تاخیر کی ضرورت نہیں ہے۔ اور کم از کم بحالاتِ موجودہ اگر معدودے چند لوگوں کی نیت درست ہو جائے اور وہ اپنی ذاتی انا کے مقابلے میں ملت کی اجتماعی خودی اور ذاتی مفادات کے مقابلے میں ملک و قوم کی مصلحتوں کو ترجیح دینے پر آمادہ ہو جائیں تو یہ اقدام فی الفور ہو سکتا ہے!

جمہوری حقوق کی دو اہم مدّیں

ثانیاً یہ وضاحت بھی مفید ہے کہ کسی ملک کے باشندوں کے سیاسی و جمہوری حقوق کی دو مدّیں اہم اور بنیادی ہیں:

ایک یہ کہ ملک میں باہم مل جل کر رہنے کے اصول و ضوابط، جن کے مجموعے کو اصطلاح میں 'ملکی دستور' سے تعبیر کیا جاتا ہے، ان کی مرضی اور رائے سے طے ہوں اور اس میں کسی قسم کے جبر و اکراہ کو دخل نہ ہو ـــــــ اور

دوسرے یہ کہ اس دستور کے مطابق حکومت کی تشکیل یا کسی ناپسندیدہ حکومت کی معزولی کا اختیار بالکلیہ ان کے ہاتھ میں ہو!

اور سب جانتے ہیں کہ ان دونوں ہی کے اعتبار سے پاکستان کے شہری گذشتہ چالیس سالوں کے دوران مسلسل محرومی اور حق تلفی کا شکار رہے ہیں۔ چنانچہ قیام پاکستان کے لگ بھگ دس برس کے بعد اور شدید محنت و کاوش سے اوائل ۵۶ء میں قوم کو ایک آئین کا تحفہ ملا ہی تھا کہ ع "اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے!" کے مصداق ۵۸ء کے مارشل لاء نے اُسے منسوخ کر دیا اور فی الواقع اس غریب کو دن کی روشنی دیکھنی نصیب ہی نہیں ہوئی اس لئے کہ اگرچہ نظری طور پر اس کی تنفید ۲۳ مارچ ۵۶ء کو ہو گئی تھی لیکن اس کا بالفعل اجراء تو نئے انتخابات کے بعد ہی ہو سکتا تھا جن کی نوبت ہی نہیں آنے پائی! ـــــــ اس کے بعد کہنے کو تو ۱۹۶۲ء میں بھی ایک آئین نافذ ہوا تھا لیکن اس کی تدوین میں عوام یا اُن کے نمائندوں کا جھوٹ موٹ کا بھی کوئی حصہ نہیں تھا اور وہ کھلے بندوں مارشل لاء ہی

کے بطن سے برآمد ہوا تھا ــــــ بعد ازاں پھر ایک طویل توڑ پھوڑ اور اکھیڑ پچھاڑ، جس میں سقوطِ مشرقی پاکستان کا حادثہ فاجعہ بھی شامل ہے، کے بعد مسٹر بھٹو نے واقعۃً ایک بڑا کارنامہ سرانجام دیا تھا کہ ۱۹۷۳ء کے آئین پر "بچے کھچے پاکستان" کے باشندوں کے جملہ نمائندوں کا اتفاقِ رائے حاصل کر لیا ــــــ لیکن افسوس کہ اوّلاً خود انہوں نے اس کی روح کو پامال کیا ــــــ اور پھر ۱۹۷۷ء سے شروع ہونے والے مارشل لا نے پہلے اُسے جزواً معطل کیا اور پھر اپنے اختیارِ حاکمانہ سے اس میں من مانی ترمیمیں بھی کر دیں۔ چنانچہ ۱۹۸۵ء میں وہ اپنی قلب ماہیت کے ساتھ از سرِ نو مارشل لا ہی کی کوکھ سے برآمد ہوا۔ اور اگرچہ رسماً تو اُسے ۱۹۷۳ء کے ترمیم شدہ آئین ہی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے لیکن اکثر لوگ اُسے ۱۹۸۵ء کا آئین کہتے ہیں! اور اگرچہ اس کی توثیق ایک منتخب شدہ نیشنل اسمبلی کر چکی ہے لیکن چونکہ وہ اسمبلی خود اس ترمیم شدہ آئین ہی کے تحت وجود میں آئی اور اُس کے لئے جو انتخابات ہوئے ان سے سیاسی جماعتوں کے عمل دخل کو خارج رکھا گیا لہٰذا اُس کی نمائندہ حیثیت مسلّم نہیں ہے ــــــ الغرض اس وقت پاکستان پھر کسی ایسے آئین و دستور سے محروم ہے جو ملک کے باشندوں کی تائید یا قبولیت کا دعویٰ کر سکتا ہو۔

یہی معاملہ انتخابات کا رہا کہ اُن کی "روایت" اس ملک میں قائم ہی نہیں ہونے دی گئی کہ عوام میں سیاسی شعور پروان چڑھ سکتا اور حکومتوں کی تشکیل یا معزولی معروف جمہوری خطوط پر ممکن ہوتی۔ اس کے برعکس یہاں جس کے ہاتھ میں جائز یا ناجائز طور پر ایک بار اقتدار آگیا اس نے ہر ممکن کوشش کی کہ صحیح یا غلط جس طور سے بھی ممکن ہو اس پر قبضہ برقرار رکھے، نتیجۃً پاکستان کی تاریخ "دھماکوں" کی داستان بن گئی۔ اور ان تحریکوں سے قطع نظر جنہوں نے عوامی ایجی ٹیشن کے ذریعے "دھماکے" کئے یہاں اگر کبھی مجبوراً انتخاب کرانے پڑے تو اُن سے بھی منفی نتائج ہی برآمد ہوئے اور انہوں نے بھی "دھماکوں" ہی کی صورت اختیار کر لی۔ چنانچہ پہلا دھماکہ "جگتو فرنٹ" نے ۱۹۵۴ء میں مشرقی پاکستان میں کیا ــــــ اور دوسرا دھماکہ ۱۹۷۰ء میں مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ اور مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی نے کیا ــــــ اور چونکہ اس "دھماکے" کے نتیجے میں ملک بھی دو لخت ہو گیا لہٰذا اب بعض

عام اور سادہ لوح پاکستانی "سانپ کا ڈسا رسی سے بھی ڈرتا ہے" کے مطابق عام انتخابات کے نام سے بھی گھبراتے ہیں۔ اور اسی بنا پر کچھ ہوشیار لوگوں کو موقع مل گیا کہ نوّے دنوں کے اندر اندر انتخابات منعقد کرانے کے دعدے کو آٹھ برس تک ٹالے رکھیں!

بہرحال اب پاکستان کے حالات جو صورت اختیار کر چکے ہیں اور ہم آخری تباہی کے جس گڑھے کے عین کنارے تک پہنچ گئے ہیں اُس کے پیشِ نظر لازم ہے کہ متذکرہ بالا دونوں حقوق کو فی الفور اور بالکل غیر مشروط طور پر عوام کے حوالے کیا جائے ——— اور ایک جانب ایسے عام انتخابات کا انعقاد جلد از جلد عمل میں لایا جائے جن میں حصہ لینے کے ضمن میں کسی پارٹی پر کوئی پابندی نہ ہو اور دوسری جانب ملکی دستور کے ضمن میں بھی اختلافات کے جس بکسے (PANDORAS BOX) کو خود جنرل محمد ضیاء الحق نے کھول دیا ہے اور جس کے بارے میں بعض انتہاپسند لوگوں نے بھی ایک متحدہ محاذ بنا لیا ہے، کھلی بحث و تمحیص کی پوری اجازت دی جائے اور آزادانہ اظہارِ خیال اور باہمی گفت و شنید کے ساتھ ملکی و قومی سطح پر اتفاقِ رائے حاصل کرنے کی بھرپور کوشش کی جائے ——— اور ان سطور کے عاجز و ناچیز راقم کو یقین ہے کہ اگرچہ حالات بہت خراب ہو چکے ہیں تاہم ابھی وقت ہے کہ اگر فوری طور پر اس معاملے میں قوم کو فیصلے کی آزادی اور اختیار دے دیا جائے تو نتائج منفی نہیں مثبت ہی برآمد ہوں گے۔ لیکن اگر اس کے ضمن میں حسبِ سابق تاخیر و تعویق کی روش جاری رکھی گئی تو شاید جلد ہی وہ وقت آجائے کہ جب یہ اقدام بھی سے "ہرچہ دانا کند، کند ناداں۔ لیک بعد از خرابیٔ بسیار!" کے مصداق بالکل بے نتیجہ اور غیر مؤثر ہو جائے گا ——— معاذ اللہ!

لسانی قومیتوں کی مناسب حد تک پذیرائی

پاکستان میں بحالیٔ جمہوریت کے متذکرہ عمل ہی کے ایک جزو لاینفک کی حیثیت سے ملک و قوم کے حقیقی اور واقعی حالات کے پیشِ نظر یہ ضروری ہے کہ قوم کے بعض طبقات میں لسانی و ثقافتی عصبیتوں کے ضمن میں جو شدید حساسیت (ALLERGY)، پائی

جاتی ہے وہ اس پر نظرِ ثانی کریں ـــــ اور تصوّر پسندی کے بلند و بالا مقام سے ذرا نیچے اتر کر کسی قدر واقعیت پسندی کا ثبوت دیں ـــــ اور لسانی اور ثقافتی اکائیوں کو حقیقتِ واقعی کی حیثیت سے تسلیم کرتے ہوئے اُن کے لئے ملکی دستور میں مناسب تحفظات کے لئے خود کو ذہناً تیار کریں۔

اس سلسلے میں ایک نہایت عمدہ مثال علامہ اقبال مرحوم کی موجود ہے ـــــ کون نہیں جانتا کہ اس صدی میں پورے عالمِ اسلام میں ' وحدتِ ملّی ' کا اُن سے بڑا قائل و داعی کوئی پیدا نہیں ہوا اور وہ آخر وقت تک اس اعلیٰ نصب العین کا پرچار کرتے رہے کہ ؎

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے ـــ نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر!

اور ؎ بتانِ رنگ و بُو کو توڑ کر ملّت میں گم ہو جا ـــ نہ ایرانی رہے باقی نہ افغانی نہ تُورانی

لیکن یہی اقبالؔ جب اس آئیڈیل کے مقابلے میں دنیا میں موجود واقعی صورتِ حال پر نظر ڈالتا ہے تو اسے یہ تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں ہوتا کہ فی الوقت دنیا میں کوئی ایک امّتِ مسلمہ موجود نہیں ہے بلکہ عملاً بہت سی مسلمان قومیں پائی جاتی ہیں۔ اور سرِدست اگر عالمی سطح پر مسلمان اقوام کا کوئی کامن ویلتھ (COMMON WEALTH) بھی قائم ہو جائے تو بہت بڑی کامیابی ہو گی ـــ (اور حقیقتِ واقعی اتنی تلخ ہے کہ علامہ اقبال مرحوم کے انتقال کو نصف صدی بیت چکی ہے اور تاحال ایسے کسی ادارے کے قیام کے بھی کوئی آثار دُور دُور تک نظر نہیں آتے) ـــــ بالکل اسی طرح سرِدست ہم اگر پاکستان میں ' قومیتوں کے مجموعے ' ہی کے لئے کوئی قابلِ قبول دستور اور لائحۂ عمل تیار کر سکیں اور پھر اپنے عمل سے باہمی اعتماد کی فضا کو پروان چڑھائیں اور وحدتِ ملّی کی جانب پیش قدمی کریں تو یہ بہت بڑی کامیابی ہو گی ـــــ اس کے برعکس اگر جذباتی انداز میں قومیتوں کی نفیٔ مطلق ہی پر اصرار رہا تو باہمی بے اعتمادی اور تشتّت و انتشار ہی میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔

ساتھ ہی یہ بھی واضح رہنا چاہیئے کہ اسلام قبائلی یا علاقائی عصبیتوں کی کُلّی نفی نہیں کرتا بلکہ عصبیتِ جاہلی کی نفی کرتا ہے یعنی جب یہ عصبیتیں اللہ اور رسولؐ کے احکام سے بھی

بالاتر ہو جائیں تب اُن کی حیثیت معبودانِ باطل کی بن جاتی ہے ـــــــ بالکل ایسے جیسے ماں یا اولاد کی محبت اصلاً غلط نہیں ہے لیکن اگر یہ محبتیں اللہ اور اس کے رسولؐ کی محبت سے بھی بڑھ جائیں اور اُن کے احکام سے آزاد اور بالاتر ہو جائیں تو یہ بھی شرکِ عملی کے ذیل میں آجاتی ہیں ـــــــ (چنانچہ اسی اصول پر قیاس کرتے ہوئے علامہ اقبال نے اس دَور کے مروّج و مقبول نظریۂ وطنیت کو شرک سے تعبیر کیا تھا! اگرچہ حبّ الوطنی ہرگز غلط نہیں بلکہ مطلوب اور پسندیدہ شے ہے!)

ایک ظاہری تضاد اور اُس کا ازالہ

اس سلسلے میں راقم اس ظاہری تضاد کو بھی رفع کرنا چاہتا ہے جو بہت سے لوگوں کو اُس کی بعض آراء کے مابین نظر آتا ہے۔ یعنی یہ کہ ایک جانب راقم کا پختہ اور طے شدہ موقف یہ ہے کہ پاکستان میں اسلام انتخابات کے ذریعے نہیں آسکتا بلکہ اس کے لئے ایک انقلاب لازمی ہے ـــــــ یہی وجہ ہے کہ راقم نے خود اپنی ذات اور اپنی جماعت یعنی تنظیم اسلامی دونوں کے بارے میں یہ قطعی اور حتمی فیصلہ کیا ہوا ہے کہ ہم انتخابات میں کبھی حصہ نہیں لیں گے بلکہ اپنے تمام اوقات اور اپنی کل مساعی کو ایک ہمہ گیر اسلامی انقلاب کی تیاری کے لئے وقف رکھیں گے ـــــــ لیکن دوسری جانب راقم اس قدر شدّومد اور یقین و اذعان کے ساتھ اس رائے کا حامل بھی ہے کہ ملک میں سیاسی عمل بہر صورت جاری رہنا چاہئے اور جدید دنیا کی مسلّم روایات کے مطابق آزادانہ انتخابات کا سلسلہ کسی صورت میں بھی نہیں رکنا چاہئے۔

یہ ظاہری تضاد ایک سادہ سی مثال سے بآسانی رفع ہو جاتا ہے۔ اور وہ یہ کہ جیسے ایک انسان کے مسلمان بننے کے تقاضے کچھ اور ہیں اور زندہ رہنے کے لوازم کچھ اور ـــــــ اسی طرح کسی ملک کے بالفعل مسلمان بننے یعنی اس میں عملاً اسلام کے نظامِ معاشرت و سیاست و معیشت کے قیام کے لوازم کچھ اور ہیں اور مجرّد زندہ رہنے یا قائم و برقرار رہنے کی شرائط کچھ اور ہیں۔ چنانچہ جیسے ایک انسان

کو مسلمان بننے کے لئے کسی نہ کسی مقدار میں ایمان کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے کہ اگر ایمان کی کوئی رمق بھی اس کے دل میں نہیں ہوگی تو وہ خواہ زبان سے اپنے اسلام کا کتنا ہی دعویٰ کرے اسلام پر بالفعل عمل پیرا نہیں ہو سکتا، جبکہ کسی بھی انسان کو خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم زندہ رہنے کے لئے غذا، پانی اور ہوا کی ضرورت ہوتی ہے اور اگر ان میں سے کسی ایک کا سلسلہ بھی منقطع ہو جائے تو اس کی موت واقع ہو جانا لازمی ہے۔ چنانچہ ہوا کی بندش سے تو موت چند لمحوں ہی میں آ جائے گی، پانی اور خوراک کے انقطاع سے بھی موت یقینی ہے اگرچہ فوری نہیں! ــــ بالکل اسی طرح کسی ملک یا معاشرے کے عملاً "مسلمان" بننے کے لئے تو ضروری ہے کہ اس میں مجموعی طور پر اسلام پر فی الجملہ اعتماد اور اسلام پر عمل پیرا ہونے کا ایک ایسا قوی جذبہ اور زوردار داعیہ پیدا ہو جائے جو پوری قوت و شدت کے ساتھ بروئے کار آئے ــــ لیکن اُس کے آزادانہ اور باوقار بقا کے لئے لازم ہے کہ اس میں ایک جانب ایک مؤثر "عصبیت" موجود ہو جو نہ صرف افراد بلکہ مختلف گروہوں اور طبقوں کو باہم متحد و مربوط رکھ سکے اور دوسری جانب تمدنی ارتقاء کی جس سطح تک وہ معاشرہ بالفعل پہنچ چکا ہو اس کے معیارات کے مطابق اطمینان بخش حد تک سماجی عدل و انصاف قائم ہو اور لوگوں میں شمولیت کا احساس (SENSE OF PARTICIPATION) برقرار رہے۔

چنانچہ ان معاشروں اور ملکوں سے قطع نظر جو تا حال ازمنۂ قدیم کے قبائلی نظام یا ازمنۂ وسطیٰ کے جاگیردارانہ نظام ہی کے ذہنی و فکری اور جذباتی و نفسیاتی ماحول میں جی رہے ہوں، عہدِ جدید کے کسی ملک اور معاشرے میں سیاسی اور جمہوری عمل کو مصنوعی طور پر روکے رکھنا اجتماعی خودکشی کے مترادف ہے! بالخصوص ایسے ممالک یا معاشرے جو مختلف لسانی و ثقافتی اکائیوں پر مشتمل ہوں اُن کے لئے تو انتخابی و سیاسی عمل کا جاری رہنا بالکل تنفس کے جاری رہنے کے مشابہ ہے اور اس کا تعطل خوفناک نتائج پیدا کر سکتا ہے۔

لیکن دوسری جانب اَلْحَمْدُ لِلّٰہ کہ راقم اس حقیقت سے بھی پوری طرح باخبر ہے کہ انتخابی یا سیاسی عمل کے ذریعے کسی ملک یا معاشرے میں قائم سماجی و معاشرتی اور سیاسی و معاشی نظام میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں لائی جا سکتی بلکہ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ پہلے سے قائم نظام کو

بہتر انداز اور زیادہ خوش اسلوبی سے چلایا جاسکے۔ اس لئے کہ انتخابی عمل کے ذریعے اکثر و بیشتر صرف وہی لوگ آگے آسکتے ہیں جو اس ملک میں قائم معاشرتی اور معاشی ڈھانچے میں قوت و طاقت کے مراکز (CENTRES OF POWER) پر قابض ہوں اور اُن سے یہ توقع کرنا عبث بلکہ حماقت ہے کہ وہ اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑی ماریں گے اور اُن مراکزِ قوت ہی میں کوئی بنیادی تبدیلی گوارا کرلیں گے جن کی اساس پر وہ خود برسرِ اقتدار آئے ہوں۔

لہٰذا راقم پوری شدت کے ساتھ یہ رائے رکھتا ہے کہ پاکستان میں اسلام تو انقلاب ہی کے ذریعے آسکتا ہے، انتخابات کے ذریعے نہیں ـــــ البتہ اگر انتخابات کے سلسلے کو رد کر رکھا گیا یا اس میں غیر فطری قدغنیں عائد کی گئیں تو اس کا شدید اندیشہ ہے کہ وہ ملک ہی باقی نہ رہے جس میں اسلامی انقلاب لایا جاسکے ـــــ اور بات وہ ہوجائے جو مرزا محمد منور بالقابہ کے اس شعر میں بیان ہوئی ہے کہ ؎

چہ دارد سعیِ ناسودے نمی یابیم مقصودے ـــ کہ برگ و خس بیاوردیم و تاراجِ آشیاں گم شد!

یہ دوسری بات کہ بہ ,, خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ ،، کے مصداق پاکستان کے مخصوص تاریخی پس منظر کے پیشِ نظر اور خاص طور پر اس وجہ سے کہ یہاں سوائے اسلامی عصبیت کے اور کوئی عصبیت ایسی موجود نہیں ہے جو کل پاکستان سطح پر بروئے کار آسکے راقم کی سوچی سمجھی رائے یہ بھی ہے کہ محض جمہوریت بھی اس ملک کے بقاء و استحکام کی دیرپا اساس نہیں بن سکتی اور بحالیٔ جمہوریت سے بلاشبہ فوری بحران تو ختم ہوجائے گا لیکن پاکستان کے دوام و استحکام کی مستقل بنیاد صرف ایک ہمہ گیر اور ہمہ جہتی اسلامی انقلاب ہی بن سکتا ہے! یہی وجہ ہے کہ راقم نے گذشتہ کم از کم بیس برس سے اپنے اکثر و بیشتر اوقات اور بہتر و بیشتر مساعی کو تو مستقبل کے ,, اسلامی انقلاب ،، کے لئے ,, برگ و خس ،، کی فراہمی کے لئے وقف کر رکھا ہے ـــــ البتہ ہمیشہ سیاسی و جمہوری عمل کے جاری رہنے کی وکالت کی ہے!

چنانچہ جنرل ضیاءُ الحق صاحب سے اپنی پہلی ملاقات کے موقع پر جو ۱۸ / اگست ۱۹۸۰ء کو پہلے علماء کنونشن سے متصلاً قبل ایک مختصر مشاورت پر ہوئی تھی راقم نے اپنے اس نقطۂ نظر کو

پیش کر دیا تھا کہ مارشل لار کا تسلسل ملک و ملت کے لئے خودکشی کے مترادف ہے۔ چنانچہ ۷/دسمبر ۸۲ء کو جو خط راقم نے جنرل صاحب کو ارسال کیا تھا اس میں بھی اس گفتگو کا حوالہ موجود ہے:

"آپ کو یاد ہوگا کہ ۱۸/اگست ۸۰ء کو بالکل علیحدگی میں گفتگو کے دوران میں نے آپ سے سوال کیا تھا کہ "ملک میں جو سیاسی خلار مارشل لار کی وجہ سے پیدا ہو گیا ہے اس کو دور کرنے کے لئے آپ کے ذہن میں کیا نقشہ ہے؟ میری رائے میں تو یہ سیاسی خلار (POLITICAL VACUUM) خودکشی کے مترادف ہے!!"..........سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد ہمارے سیاسی مبصروں اور تجزیہ نگاروں نے مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے اسباب میں سب سے زیادہ اہمیت کے ساتھ اس سبب کو بیان کیا تھا کہ پاکستان میں (ایوب خاں مرحوم کے) مارشل لار کے نفاذ نے وہاں کے لوگوں میں سیاسی محرومی کا احساس پیدا کر دیا تھا اور علیحدگی پسندوں کے ہاتھ میں سب سے بڑی دلیل یہ آگئی تھی کہ فوج چونکہ ساری مغربی پاکستان کی ہے لہٰذا فوج کی حکومت کے معنی یہ ہیں کہ مغربی پاکستان 'مشرقی پاکستان' پر حکومت کر رہا ہے۔ آج بعینہٖ یہی دلیل سندھ کے علیحدگی پسندوں کے ہاتھوں میں ہے کہ فوج کا اکثر و بیشتر حصہ پنجاب سے ہے اور کچھ تھوڑا سا سرحد سے۔ لہٰذا مارشل لار کے پردے میں اصلاً 'پنجاب' ہم پر حکومت کر رہا ہے ـــــ اور ہر گزرنے والا دن اس دلیل کو قوی سے قوی تر کر رہا ہے! ـــــ بنا بریں میں عرض کرتا ہوں کہ خدارا اس تعطل کو جلد از جلد رفع کرنے کی جانب واضح پیش قدمی فرمائیے۔ ایسا نہ ہو کہ یہ آتش فشاں پھٹ پڑے اور پھر ملک و ملت کے کسی بھی بہی خواہ کے کئے کچھ نہ ہو سکے۔!!"

دو ممکنہ عملی صورتیں

پاکستان میں بحالیٔ جمہوریت کا عمل چونکہ دو اجزار پر مشتمل ہے۔ یعنی ایک یہ کہ تشکیلِ حکومت بالکلیہ عوام کے آزادانہ ووٹ کی بنیاد پر ہو اور دوسرے ملکی دستور بھی بالکلیہ عوام کی

اکثریت کی رضا اور پسند کے مطابق ہو —— لہٰذا اس کے ضمن میں عملی راہیں بھی دو ممکن ہیں؛ یعنی ایک یہ کہ پہلے ۱۹۷۳ء کے اصل دستور کے مطابق ملک میں انتخابات ہوں اور پھر جو اسمبلی اس طرح وجود میں آئے وہ اسی دستوری طریقِ کار کے مطابق دستور میں ترمیم کرے جو خود اس دستور میں طے شدہ ہے —— اور دوسرے یہ کہ پہلے ایک دستور ساز اسمبلی کا انتخاب عمل میں لے آیا جائے اور وہ ایک قابلِ قبول دستور تیار کرے جس کے مطابق انتقالِ اقتدار کے لئے دوبارہ انتخاب ہو! اور اس وقت تک جو بھی انتظامی ڈھانچہ فی الوقت موجود ہے وہ ایک عارضی نگران (CARE TAKER) ادارے کی حیثیت سے برقرار رہے۔

اس وقت ملک و ملّت جس صورتِ حال سے دوچار ہیں اُن کے پیشِ نظر تو راقم کی رائے پہلے طریقے ہی کے حق میں ہے اور اَلْحَمْدُ لِلّٰه کہ ملک میں اس کے لئے تدریجاً ایک اتفاقِ رائے وجود میں آتا نظر آ رہا ہے —— لیکن آج سے چار سال قبل کے حالات میں جبکہ جنرل محمد ضیاء الحق ایک غیر جماعتی انتخاب ہی پر تلے ہوئے تھے، راقم نے جو تجویز جنرل صاحب کے نام خط میں پیش کی تھی اسے بھی دوبارہ ریکارڈ پر لے آنا مناسب ہے تاکہ اُس کا ذہن بلا کم و کاست قوم کے سامنے آ جائے! چنانچہ وہ لفظ بلفظ درج ذیل ہے:

"مجھے خوب اندازہ ہے کہ ایک جانب ہم اس وقت جس صورتِ حال سے دوچار ہیں، اس میں اکثر سیاسی جماعتوں کے 'مبیّنہ' موقف کے مطابق ۱۹۷۳ء کے دستور کے تحت انتقالِ اقتدار کیلئے فوری انتخاب میں بہت سی پیچیدگیاں مضمر ہیں۔ دوسری جانب ملک کے آئندہ نظام کے بارے میں آپ کے ذہن میں جو مختلف تجویزیں ہیں، وہ بھی ملک و ملت کی خیر خواہی کے جذبے پر مبنی ہیں —— اور تیسری جانب مختلف سیاسی حلقوں کی طرف سے بھی جو اختلافِ رائے ان موضوعات پر سامنے آ رہا ہے کہ انتخابات جداگانہ ہوں یا مخلوط! اور حسبِ سابق ہوں یا متناسب نمائندگی کے اصول پر! وغیرہ وغیرہ — وہ بھی یقیناً خلوص و اخلاص ہی پر مبنی ہیں —— لیکن میرے نزدیک اصل سوال یہ ہے کہ ان معاملات میں آخری فیصلہ کرنے کا مجاز کون ہے؟ کیا صرف آپ اور آپ کے رفقاءِ کار، یعنی مارشل لاء انتظامیہ!

یا زیادہ سے زیادہ وہ سیاسی جماعتیں جو کسی درجے میں آپ کی منظورِ نظر ہیں یا کم از کم آپ کے لئے قابلِ قبول ہیں ـــ؟؟ یا کوئی اور ـــ؟؟؟

میں اس مسئلے پر کم از کم چھ ماہ سے مسلسل غور کرتا آ رہا ہوں ـــ اور ایک رائے جس پر میرا دل ٹھک گیا ہے، تجویز کی صورت میں خالصۃً ملک و ملت اور خود آپ کی خیر خواہی کے جذبے کے تحت آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں - وہ تجویز یہ ہے کہ:

(۱) ملک میں ایک انتخاب فوراً ہو۔ یعنی فروری یا مارچ ۸۲) لیکن یہ انتخاب انتقالِ اقتدار یا تشکیلِ حکومت کے لئے نہ ہو بلکہ ایک منتخب مجلسِ شوریٰ، یا مجلسِ ملی، کے لئے ہو ـــ اس میں حق رائے دہی کی اساس اور حلقہ جات کی تشکیل تو بالکل وہی ہو جس پر فروری ۷۷ء میں انتخابات ہوئے تھے۔ لیکن ہو یہ خالص غیر جماعتی بنیاد پر!

(۲) اس طرح جو مجلسِ شوریٰ یا مجلسِ ملی وجود میں آئے اس کے سامنے ملک کے آئندہ نظام کے بارے میں جو تجاویز آپ کے سامنے ہیں، وہ آپ رکھیں اور طرزِ انتخاب وغیرہ کے ضمن میں جو باتیں دوسرے لوگوں کے سامنے ہیں، انہیں وہ رکھیں اور ان تمام پر یہ مجلس ایک سال کے عرصے کے اندر اندر فیصلہ دے، جو نہ صرف یہ کہ دو تہائی اکثریت پر مبنی ہو بلکہ ہر صوبے سے منتخب شدہ لوگوں کی بھی کم از کم نصف تعداد لازماً اس میں شامل ہو ـــ!

(۳) اگر یہ مجلس اس مشکل مرحلے کو کامیابی سے سر کر لے اور مطلوبہ اکثریت کے ساتھ نظام تجویز کر دے تو مارشل لا انتظامیہ تین سے چھ ماہ کے اندر اندر اس کے مطابق انتقالِ اقتدار اور تشکیلِ حکومت کے لئے الیکشن کرا دینے کی پابند ہو ـــ اور اگر وہ مجلس ایک سال کے اندر اندر تفویض کردہ ذمہ داری سے عہدہ برآنہ ہو سکے تو وہ از خود تحلیل (DISSOLVE) ہو جائے اور پھر تین سے چھ ماہ کے عرصے میں اسی مجلسِ شوریٰ، یا مجلسِ ملی، کا انتخاب دوبارہ ہو اور جب تک مطلوبہ اتفاقِ

رائے (CONCENSUS) حاصل نہ ہو یہ سلسلہ جاری رہے ـــــ اور اس دوران میں فوج کے لئے نہ صرف اخلاقاً جائز بلکہ ملک و قوم کی حفاظت و سالمیت کے اعتبار سے لازم سمجھا جائے کہ وہ 'CARE TAKER' کی حیثیت سے کاروبار حکومت چلاتی رہے ـــــ!

اس تجویز کے محاسن یا روشن پہلوؤں پر گفتگو کو میں اس لئے تحصیل حاصل سمجھتا ہوں کہ وہ اظہر من الشمس ہیں ـــــ البتہ اس کے خلاف اس واحد دلیل کا جائزہ لینا لازمی ہے جو بادی النظر میں بہت قوی معلوم ہوتی ہے یعنی یہ کہ کہیں مجوّزہ مجلس شوریٰ یا مجلس ملّی ایک بھرپور دستوریہ (FULL FLEDGED CONSTITUENT ASSEMBLY) کا کردار اختیار نہ کرلے اور دستوریہ کی کے خطرناک صندوقچے (PANDORAS BOX) کو کھول کر اُن نازک اور پیچیدہ مسائل کو از سرِ نو نزاعی نہ بنادے جو ۱۹۷۳ء کے دستور میں طے شدہ ہیں۔

میرے نزدیک یہ دلیل بہت کمزور اور بودی ہے، اس لئے کہ مسائل کا حل ان سے اعراض اور صرفِ نظر سے نہیں بلکہ مقابلے اور مواجہے (یعنی 'FACE' کرنے) ہی سے ممکن ہوتا ہے۔ پاکستان کا قیام محض ایک وقتی حادثہ نہ تھا بلکہ ہندو جیسی منظّم اور بیدار قوم اور وقت کی حکمران طاقت (لیبر گورنمنٹ) کی متفقہ خواہشات کے علی الرغم پاکستان صرف اس لئے قائم ہوا کہ ایک طرف مسلمانانِ ہند کے لئے ہندوؤں کے انتقامی طرزِ عمل کے اندیشے کا منفی محرک موجود تھا تو دوسری طرف احیاءِ اسلام کا مثبت جذبہ بھی موجود تھا جسے قائد اعظم مرحوم کے مسلسل اعلانات نے ایک نہایت قوی امید کی صورت دے دی تھی ـــــ اور تیسری طرف ارادۂ الٰہی اور مشیّتِ ایزدی بھی شامل تھی جو اصل فیصلہ کن عامل (FACTOR) ہے۔ اور یہ تینوں عوامل اب بھی پوری قوت و شدّت کے ساتھ موجود ہیں۔ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ ان کو بروئے کار لانے کی کوشش کی جائے (یعنی انہیں 'MOBILISE' کیا جائے) اور یہ کام ان شاء اللہ اس مجوّزہ مجلسِ شوریٰ یا مجلسِ

ملّی اور اس کے لئے منعقد ہونے والے انتخابات کے ذریعے ہو جائے گا۔ اس لئے کہ چونکہ یہ انتخابات نہ تشکیلِ حکومت کے لئے ہوں گے اور نہ ہی جماعتی بنیادوں پر ہوں گے۔ لہٰذا اس میں سیاسی حلقوں اور جماعتوں کی صف بندی (POLARISATION) خالصتہً اس اساس پر ہو گی کہ کون محبِّ دین اور محبِّ وطن ہے! اور کون لادینیّت، الحاد، مادہ پرستی، اباحیت اور علاقائی و لسانی قومیتوں کا عاشق اور پرستار —!! اور مجھے یقین ہے کہ اگر تقسیم اس واضح اساس پر ہو تو ان شاء اللہ فیصلہ کُن فتح محبِّ اسلام اور محبِ پاکستان قوتوں کو حاصل ہوگی۔ جیسے کہ اکثر مبصّرین اور تجزیہ نگار حضرات نے سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد کہا تھا کہ وہاں اگر لوگوں کے سامنے اصل مسئلہ یہ رکھا جاتا کہ 'پاکستان' کے ساتھ رہنا چاہتے ہو یا اس سے علیحدہ ہونا؟ تو وہاں کے عوام کی غالب اکثریت لامحالہ 'متحدہ پاکستان' کے حق میں رائے دیتی! مجھے اس تجزیئے سے کامل اتفاق ہے — اور مجھے یقینِ واثق ہے کہ میری تجویز پر عمل درآمد کے نتیجہ میں ان شاء اللہ العزیز 'تحریکِ پاکستان' کے از سرِ نو احیاء کا وہ مقصد بأحسن وجوہ حاصل ہو جائے گا جس کے لئے آپ ہر سال 'یومِ پاکستان' — 'یومِ اقبال' — اور 'عید میلاد النبیؐ' منانے کے ضمن میں کروڑوں روپے صرف کر رہے ہیں۔ (جو معاف فرمائیے، اکثر و بیشتر ضیاعِ محض ہے۔)

اَلْحَمْدُ لِلّٰہ کہ ان سطور پر وہ تحریر ختم ہوتی ہے جو 'استحکامِ پاکستان' کے بعد اور "پاکستان میں اسلامی انقلاب: کیا؟ کیوں؟ اور کیسے؟" سے پہلے صوبۂ سندھ اور خاص طور پر کراچی کے حالات و واقعات سے شدید تاثر کی بنا پر ایک طویل جملۂ معترضہ کے طور پر سپردِ قلم ہو گئی —

اب ان شاء اللہ جلد ہی اسلامی انقلاب کے موضوع پر اصل کتاب کی تسوید شروع ہو جائے گی جس کا مکمل مواد بحمداللہ ذہن میں موجود ہے — اور جس پر

راقم نے پاکستان کے تمام بڑے شہروں میں تو مفصّل تقریریں کی ہی ہیں، اس سال ماہِ اگست کے اوائل میں امریکہ میں اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکا I.S.N.A کے مرکز واقع پلین فیلڈ میں منعقدہ ایک چھ روزہ کیمپ میں بھی مفصّل تقریریں ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کیں جن کے دو دو گھنٹوں کے چھ وڈیو کیسٹ تیار ہوئے، اور اس طرح گویا زبان و بیان کی حد تک یہ بات پورے شرح و بسط کے ساتھ بیرونِ پاکستان بھی پہنچ چکی ہے۔

ضمیمه

دستور سازی کا مسئلہ پاکستان میں اوّل روز سے مشکلات اور پیچیدگیوں کا حامل رہا ہے اور مشرقی پاکستان کی علیحدگی میں بھی اس کا بہت بڑا حصّہ ہے۔ برادرِ محترم ڈاکٹر اسرار احمد کا ذہن اِس سلسلے میں ابتداء ہی سے واضح اور صاف رہا ہے۔ مشرقی پاکستان کے مسئلے پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے موصوف نے جولائی ۶۹ء کے 'میثاق' میں 'تذکرہ و تبصرہ' کے عنوان سے جو فکر پیش کی تھی اُسی انداز کی سوچ ۸۲ء میں باقی ماندہ پاکستان کے دستوری مسئلے کے حل کے لیے صدر ضیاء الحق کے نام خط میں سامنے آئی۔ مسئلہ سندھ کے حوالے سے یہ کتاب بھی اُن کے اُسی اندازِ فکر کی آئینہ دار ہے۔ اِس سلسلے میں انہوں نے کراچی کے حالیہ ہنگاموں کے فوراً بعد ۱۷ دسمبر ۸۶ء کو ایک پریس کانفرنس سے بھی خطاب کیا تھا۔ اسی مناسبت سے پریس کانفرنس میں پڑھے گئے بیان کا مکمل متن جو اب تک اپنی مکمل شکل میں کہیں شائع نہیں ہوا اور جولائی ۶۹ء کے تذکرہ و تبصرہ کے اقتباس کی نقل کو اِس ضمیمے میں شامل کیا جا رہا ہے۔ اِس کے علاوہ سندھ کی زمینوں کے مسئلے سے متعلق ایک سندھی بزرگ ماسٹر اللہ رکھا صاحب کی تاریخی روایت پر مبنی رفیقِ محترم نجیب صدیقی صاحب کے خط کے مشمولات جو جنوری ۸۷ء کے 'میثاق' میں شائع ہو چکے ہیں بطورِ قندِ مکرر کے طور پر پیشِ خدمت ہیں۔ (ناشر)

دستور سازی کا مسئلہ اور مشرقی پاکستان

(اقتباس از میثاق بابت جولائی ۱۹۶۹ء)

"... اور یہ اسی پیچیدگی اور اشکال کا نتیجہ ہے کہ بائیس سال کی طویل مدت میں بھی پاکستان کا کوئی دستور نہیں بن سکا اور دستور سازی کے میدان میں نہ صرف یہ کہ ہنوز روزِ اول کا معاملہ ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ دور دور تک امید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی اور الجھاؤ روز بروز بڑھتا چلا جا رہا ہے!!!

اس اشکال اور الجھاؤ کا مستقل حل تو ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ دینی جذبات اور ملّی احساسات کو مسلسل اجاگر کیا جاتا رہے اور اس جذبہ کے دوام اور تسلسل کا مستقل اور پائیدار بندوبست کیا جائے جو ایک دوسرے سے اتنے بعید اور باہم اس قدر مختلف خطوں کے ایک مملکت میں شامل ہونے کا سبب بنا تھا۔ تاہم فوری طور پر بعض دوسری چیزیں بھی پیشِ نظر رہنی ضروری ہیں:

ایک یہ کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے اس سنجوگ کا برقرار رہنا مشرقی پاکستان کے عوام کی آزاد مرضی ہی پر منحصر ہے اور اسے کسی طرح بھی ان پر ٹھونسا نہیں جا سکتا۔ بلکہ اس معاملے میں جبر و تشدد کا ردِ عمل نہایت خوفناک ہو سکتا ہے۔

دوسرے یہ کہ اس "آزاد مرضی" کا انحصار بھی جتنا کچھ دینی جذبات اور ملّی احساسات پر ہے اتنا ہی اس امر پر بھی ہے کہ نہ صرف یہ کہ وہ یہ محسوس کریں کہ ہمارے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں ہو رہی بلکہ مثبت طور پر انہیں یہ احساس بھی ہو کہ خود ان کا مفاد مغربی پاکستان کے ساتھ رہنے ہی سے وابستہ ہے اور مشرقی اور مغربی پاکستان دونوں ایک دوسرے سے پیوستہ رہ کر ہی دنیا میں ایک باعزت اور باوقار آزاد مملکت کی حیثیت سے زندہ رہ سکتے ہیں۔

مزید برآں یہ کہ اگر خدانخواستہ کبھی "علیحدگی" کی صورت پیدا ہوئی تو مغربی پاکستان کے لئے تو پھر بھی امکان غالب موجود ہے کہ وہ اپنی آزاد اور باوقار حیثیت کو برقرار رکھ سکے گا، لیکن مشرقی پاکستان کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ ہو گا کہ کسی دوسری وسیع تر قومیت

میں ضم اور کسی دوسری بڑی مملکت میں جذب ہو کر رہ جائے۔

ان دو امور کی روشنی میں جائزہ لیا جانا چاہیئے کہ مشرقی پاکستان کے عوام کی مرضی دراصل ہے کیا؟ ــــ اگر وہ واقعۃً مغربی پاکستان سے علیحدہ ہو کر ایک آزاد اور خود مختار حکومت قائم کرنے کے خواہش مند ہیں تو ظاہر ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت ان کی اس خواہش کے آڑے نہیں آسکتی۔ بین الانسانی علائق میں سب سے زیادہ مقدس رشتہ میاں اور بیوی کا ہوتا ہے لیکن اس میں بھی دینِ فطرت نے علیحدگی کی ایک سبیل رکھ دی ہے اور صاف ہدایت کی ہے کہ اگرچہ طلاق 'حلال چیزوں میں اللہ کو سب سے زیادہ ناپسند ہے تاہم "معلق" رکھنے سے بہتر یہی ہے کہ علیحدگی اختیار کر لی جائے ــــ بالکل اسی طرح اگر ہمارے مشرقی پاکستانی بھائی واقعۃً یہ محسوس کرتے ہوں کہ مغربی پاکستان کے ساتھ رہنے میں انہیں کوئی فائدہ نہیں بلکہ نقصان ہے تو اُن کی بے اطمینانی کے سبب سے پورے ملک کی سیاسی و دستوری زندگی کو مسلسل 'معلق' رکھنے سے بہتر یہ ہے کہ اُن کی مرضی کو بروئے کار آنے کا موقع دے دیا جائے۔

ہم نے اوپر بھی عرض کیا تھا ــــ اور اب مزید وضاحت سے کہے دیتے ہیں کہ مشرقی و مغربی پاکستان کے مابین 'مساوات' کا مفہوم اگر یہ ہے کہ دارالحکومت ایک مغربی پاکستان میں ہو اور دوسرا مشرقی پاکستان میں اور مرکزی حکومت چھ ماہ وہاں رہے اور چھ ماہ یہاں۔ اور دفاعی اخراجات میں بھی لازماً کامل مساوات برتی جائے تو یہ خالص احمقانہ تصور ہے۔ ایسی مساوات خاندان کے مختصر سے ادارے میں بھی نہیں چل سکتی۔ کُجا یہ کہ ایک عظیم مملکت جو طرح طرح کی پیچیدگیوں سے دوچار ہو، اس کے انتظام و انصرام میں برتی جا سکے اور ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اس سے کہیں بہتر ہے کہ دونوں خطّے آزاد ہو کر اپنے اپنے بقا و استحکام اور تعمیر و ترقی کی فکر کریں ــــ!!

لیکن ہمیں یقین ہے کہ مشرقی پاکستان کے عوام کی خواہش ہرگز یہ نہیں ہے کہ وہ مغربی پاکستان سے علیحدہ ہوں۔ اور اگرچہ ماضی قریب میں ان پر یہ 'بہتان' کثرت سے لگایا گیا ہے کہ ان میں 'علیحدگی پسندی' کا رجحان موجود ہے۔ ہم یہ باور نہیں کر سکتے کہ مشرقی پاکستان کے مسلمان حقائق و واقعات اور موجود الوقت ظروف و احوال سے اتنے بے خبر ہو سکتے ہیں کہ ان خطرات کا اندازہ نہ کر سکیں جو ایسی کسی تجویز میں لازماً مضمر ہیں ــــ

ہمارا اندازہ یہ ہے کہ ان میں زیادہ سے زیادہ بس "صوبائی خود اختیاری" کے حصول کی خواہش ہے اور وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ صوبائی معاملات میں انہیں زیادہ سے زیادہ آزادی حاصل ہو اور یہ ہمارے نزدیک ان کا ایک ایسا حق ہے جس سے کسی بھی معقول انسان کو کوئی اختلاف نہیں ہو سکتا۔ اور مرکزی حکومت کے مؤثر طور پر اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہونے کے لئے جو امور ضروری ہیں انہیں مرکز کی تحویل میں دینے کے بعد بقیہ تمام معاملات میں مشرقی پاکستان کو کامل صوبائی خود اختیاری لازماً ملنی چاہیئے۔

انہی متذکرہ بالا دو امور کی روشنی میں دستور کے مسئلے پر بھی ایک بار حتمی طور پر فیصلہ کر لینے کی شدید ضرورت ہے اور تمام حالات و واقعات کا مردانہ وار مواجہہ کر کے اس مسئلے کو ایک بار قطعی طور پر طے کر لینا لازمی ہے اور اگرچہ ہم ان لوگوں میں سے ہیں جن کے نزدیک کسی مملکت کے انتظام و انصرام میں اصل فیصلہ کن عامل کی حیثیت دیانت و امانت کو حاصل ہے نہ کہ قواعد و ضوابط اور تدابیر تحدید و توازن (CHECKS AND BALANCES) کے اس بے جان ڈھانچے کو جسے "دستور" کہا جاتا ہے — تاہم ہمارے یہاں جو خلا اس میدان میں چلا آ رہا ہے اسے ایک بار جرأت و ہمت کے ساتھ عوام کی آزادانہ رائے کے مطابق پُر کر لینا ہی بہتر ہے۔

بیان پریس کانفرنس

منعقدہ ۱۷ دسمبر ۱۹۸۶ء

کراچی اور حیدر آباد میں ان دنوں جس قتل و غارت گری کا بازار گرم ہے، ایسے محسوس ہوتا ہے کہ یہ ملّتِ اسلامیہ پاکستان کے لئے اللہ تعالیٰ کی جانب سے آخری تنبیہ ہے اور اگر ہم اب بھی ہوش میں نہ آئے تو اللہ کی شان بے نیازی سے کچھ بعید نہیں کہ نہ صرف پاکستان بلکہ پورے جنوبی ایشیا میں مسلمانوں کا وہی حشر ہو جو اب سے لگ بھگ پانچ سو سال قبل سپین میں ہوا تھا ـــــــ اس لئے کہ ہم نے قیام پاکستان کے ضمن میں اللہ تعالیٰ سے جو وعدے کئے تھے اُن کی مسلسل خلاف ورزی کے باعث اللہ کے اٹل قانون کے مطابق عملی نفاق کی سزا تو ہم پر بہت عرصے سے مسلط ہے۔

فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ	ـــــ "تو اللہ نے سزا کے طور پر اُن
قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ	کے دلوں میں نفاق پیدا کر دیا اس دن تک
يَلْقَوْنَهٗ بِمَآ اَخْلَفُوا	کے لیے جب وہ اس کے حضور حاضر ہوں گے
اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا	بہ سبب اس کے کہ انہوں نے اللہ سے جو وعدہ
يَكْذِبُوْنَ ۔	کیا تھا، اس کی خلاف ورزی کی اور بوجہ اس
	جھوٹ کے جو وہ بولتے تھے۔

جس کے نتیجے میں پوری قوم کے اخلاق و کردار کا دیوالہ نکل چکا ہے، اور جھوٹ، خیانت، بدعہدی اور ذرا سے اختلاف پر آپے سے باہر ہو جانے کی جن چار صفات کا ذکر ایک متفق علیہ حدیث میں نفاق کی علامات کے طور پر آیا ہے وہ سب کی سب قوم کی اکثریت میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔

عن عبد الله ابن عمرو رضؓ ـــــ حضرت عبداللہ ابن عمرو ابن العاص

قال قال رسول اللہ صلی اللہ	رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی اکرم
علیہ وسلم: اَربَعٌ مَن کُنَّ	صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
فِیہِ کَانَ مُنافِقاً	"چار باتیں جس شخص میں موجود ہوں گی،
خَالِصاً وَمَن کَانَت فِیہِ	وہ خالص منافق ہوگا اور جس میں ان میں
خَصلَۃٌ منھن کانت فیہِ	سے کوئی ایک خصلت ہوگی اس میں
خَصلَۃٌ مِنَ النِّفَاقِ	اسی کی نسبت سے نفاق ہوگا یہاں
حَتّٰی یَدَعَھَا: اِذَا اؤتُمِنَ	تک کہ اسے چھوڑ دے۔ جب امانت
خَانَ وَاِذَا حَدَّثَ کَذَبَ	کا حامل بنایا جائے خیانت کا ارتکاب
وَاِذَا عَاھَدَ غَدَرَ وَاِذَا	کرے، جب بات کرے جھوٹ بولے جب
خَاصَمَ فَجَرَ: (متفق علیہ)	عہد کرے تو بے وفائی کرے اور جب

(کسی سے) جھگڑے تو آپے سے باہر ہو جائے۔"

——— اخلاق اور کردار کے اس بحران (CRISIS) کے علاوہ ہماری پیٹھ پر عذابِ خداوندی کا جو کوڑا اب سے ٹھیک پندرہ سال قبل سقوطِ مشرقی پاکستان اور اس کے ضمن میں اپنے پیدائشی دشمن بھارت کے ہاتھوں ایک انتہائی ذلت آمیز شکست کی صورت میں پڑا تھا اس کی حیثیت قرآن میں بیان شدہ قانونِ خداوندی (سورہ سجدہ: آیت ۲۱) کے مطابق آخری سزا سے پہلے خوابِ خرگوش سے بیدار کرنے والی تنبیہہ کی تھی ——— لیکن چونکہ ہم اس پر بھی ہوش میں نہیں آئے، اور نہ ہماری ذاتی زندگیوں کے رنگ ڈھنگ بدلے نہ اجتماعی سطح پر قومی و ملی تعمیر کی کوئی مؤثر کوشش ہوئی، لہٰذا اب عذابِ الٰہی کی اس شدید ترین صورت کا آغاز ہو گیا ہے۔

جس کا ذکر سورۃ الانعام کی آیت ۶۵ میں ملتا ہے:

قُل ھُوَ القَادِرُ عَلٰٓی اَن	کہہ دو (اے نبی) وہ اس پر قادر ہے
یَّبعَثَ عَلَیکُم عَذَابًا مِّن	کہ تم پر عذاب اوپر سے بھیجے یا تمہارے

فَوۡقِكُمۡ اَوۡ مِنۡ تَحۡتِ اَرۡجُلِكُمۡ اَوۡ يَلۡبِسَكُمۡ شِيَعًا وَّيُذِيۡقَ بَعۡضَكُمۡ بَاۡسَ بَعۡضٍ ؕ (الانعام: ۶۵)

پاؤں کے نیچے سے یا تمہیں مختلف فرقے (گروہ) کرکے ٹکرا دے اور ایک کو دوسرے کی جنگی قوت کا مزہ چکھا دے۔

—— چنانچہ ہر شخص دیکھ رہا ہے کہ مملکتِ خداداد پاکستان میں مسلم قومیت کا تصور رفتہ رفتہ تحلیل ہو کر نسلی اور لسانی قومیتوں کی صورت اختیار کر چکا ہے اور اب ان قومیتوں کے مابین ذہنی و قلبی بُعد ہی نہیں، نفرت و عداوت کے جذبات بھی پیدا ہو گئے ہیں جن سے ہمارے اندرونی اور بیرونی دشمن بھرپور فائدہ اٹھا رہے ہیں، جس کی بدترین مثال کراچی کی حالیہ وحشیانہ ہی نہیں، سفاکانہ قتل و غارت گری ہے!۔ اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ بحالاتِ موجودہ جو سب سے بڑی دُعا کی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ موجودہ عذاب بھی سُورۃ سجدہ کی آیات کے مطابق سابقہ تنبیہات کی طرح ایک تنبیہہ ہو۔

وَلَنُذِيۡقَنَّهُمۡ مِّنَ الۡعَذَابِ الۡاَدۡنٰى دُوۡنَ الۡعَذَابِ الۡاَكۡبَرِ لَعَلَّهُمۡ يَرۡجِعُوۡنَ ۝ (السجدۃ: ۲۱)

اور ہم اُنہیں لازماً قریب کا عذاب بھی اُس بڑے عذاب سے پہلے چکھائیں گے تاکہ وہ باز آجائیں۔

اور ہمیں سُورۃ انبیاء کی آیت ۱۱۱ کے مصداق کُلّی خاتمے والے عذاب سے قبل کچھ مزید مہلتِ عمل مل جائے،

وَاِنۡ اَدۡرِىۡ لَعَلَّهٗ فِتۡنَةٌ لَّكُمۡ وَمَتَاعٌ اِلٰى حِيۡنٍ ۝ (الانبیاء: ۱۱۱)

اور مَیں نہیں جانتا شاید کہ یہ (مہلت) تمہارے لئے مزید ایک آزمائش اور ایک وقتِ معیّن تک مزید فائدہ اٹھا لینے کا موقع ہو۔

—— لیکن اس کی شرطِ لازم یہ ہے کہ پوری قوم کامل خلوص و اخلاص کے ساتھ اللہ کی جناب میں توبہ کرے اور ایک طرف ہر مسلمان صمیمِ قلب کے ساتھ

عہد کرے کہ وہ آئندہ انفرادی طور پر خود اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہیں کرے گا، اور اللہ کے دین کی سربلندی کے لئے اجتماعی جدوجہد میں تن من دھن لگا دے گا۔ اور دوسری طرف جملہ سیاسی تنظیمیں اور خاص طور پر دینی جماعتیں بھی حالات کی سنگینی اور وقت کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے اپنے موقف اور طریق کار پر نظرِ ثانی کریں اور اس راہ میں نہ ضد اور ہٹ دھرمی کو رکاوٹ بننے دیں، نہ گروہی یا جماعتی مصلحتوں کو آڑے آنے دیں۔

اس کے علاوہ سیاسی اور انتظامی سطح پر بھی چند فوری اقدامات لازمی اور ناگزیر ہیں۔ اور ان کے ضمن میں اللہ تعالیٰ ہی سے دعا ہے کہ وہ اربابِ اقتدار اور اصحابِ حل و عقد کو توفیق دے کہ وہ ذاتی انا کے خول اور خوشامدیوں کے حصار سے نکل کر حقائق کا مشاہدہ کر سکیں اور صحیح اور بروقت اقدامات کے لئے مناسب قوتِ ارادی کو بروئے کار لا سکیں ——— وہ ناگزیر اقدامات حسبِ ذیل ہیں:

۱ - سندھ کی صوبائی حکومت کی نا اہلی اور ناکامی کے اس بیّن اور خوفناک ثبوت کے بعد اس کا مزید ایک دن برقرار رہنا بھی غلط ہے۔ لہٰذا اسے فوراً برطرف کر کے گورنر راج قائم کیا جائے اور گورنری کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لئے صوبہ سندھ ہی سے تعلق رکھنے والی کسی معروف اور با اثر شخصیت کو آمادہ کیا جائے!

۲ - جنرل محمد ضیاء الحق صاحب کی نا اہلی اور ناکامی بھی اظہر من الشمس ہو چکی ہے اور اگرچہ اصولاً تو انہیں فوری طور پر پاکستان کی صدارت اور فوج کے چیف آف سٹاف دونوں عہدوں سے سبکدوش ہو جانا چاہیئے ——— لیکن اگر اس صورت میں کسی فوری دستوری بحران کا اندیشہ ہو تو انہیں کم از کم ان میں سے ایک عہدے کو تو فوراً چھوڑ دینا چاہیئے ——— تاکہ یہ تاثر کسی قدر کم ہو سکے کہ موجودہ حکومت سابقہ مارشل لاء ہی کے تسلسل کی حیثیت رکھتی ہے۔

۳ - اس تلخ حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے کہ فی الوقت ملکی سطح پر مسلم قومیت کا جذبہ بے حد کمزور پڑ چکا ہے اور فی الواقع اس کی جگہ نسلی اور لسانی قومیتوں نے لے لی ہے۔ لہٰذا اصلاح کے عمل کا آغاز اُن کی نفی سے نہیں بلکہ انہیں مناسب

حد تک تسلیم کرتے ہوئے ہی کیا جا سکتا ہے۔ ملکی دستور کے ضمن میں مرکز اور صوبوں کے مابین اختیارات کی تقسیم کے علاوہ زبان اور ثقافت کی اساس پر نئے صوبوں کی تشکیل کے مطالبات کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے اور اس معاملے میں قومی سطح پر اتفاقِ رائے (CONCENSUS) کے حصول کو اوّلین ترجیح دی جانی چاہیئے۔ جس کے لئے حسب ذیل دو صورتوں میں سے کوئی سی صورت اختیار کی جا سکتی ہے۔

ا۔ ۱۹۷۳ء کے اصل متفق علیہ آئین کو صرف قادیانیوں سے متعلق ترمیم کے ساتھ فوراً بحال کر دیا جائے اور اس کے تحت جماعتی بنیاد پر جلد از جلد انتخابات کرائے جائیں جن کے ضمن میں رجسٹرڈ اور غیر رجسٹرڈ کی کوئی تقسیم حائل نہ ہو۔ اس کے بعد آئندہ قومی اسمبلی ہی دستور میں طے شدہ طریق پر دستور میں مطلوبہ ترامیم کرے!

ب۔ فوری طور پر غیر جماعتی بنیاد پر ایک دستور ساز اسمبلی کا انتخاب کرا دیا جائے جو ایک سال کے اندر اندر ایسا دستور تیار کرے جس پر پوری اسمبلی کے ارکان کی کم از کم دو تہائی تعداد متفق ہو جس میں ہر صوبے کے اراکین اسمبلی کی بھی کم از کم نصف تعداد ضرور شامل ہو۔ پھر اس نئے دستور کے مطابق انتقال اقتدار کے لئے از سر نو انتخاب ہو!

آخر میں ایک بار پھر اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ وہ اپنے خصوصی فضل و کرم سے پاکستان کی کشتی کو، جو اس کے دین ہی کے نام پر قائم ہوا تھا موجودہ مسائل و مشکلات کے بھنور سے نکال لے ـــ اور قوم کے خواص و عوام سب کو صحیح فہم اور مناسب عمل کی صلاحیت عطا فرمائے۔ آمین۔

خاکسار اســـرار احمد عفی عنہ

۱۷ دسمبر ۸۶ء

امیر تنظیم اسلامی و صدر مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

سندھ کی اراضی کے بارے میں بعض اہم تاریخی حقائق

(ماخوذ از "میثاق" بابت جنوری ۸۷ء)

اپنی تحریر "مسئلہ سندھ" میں محترم ڈاکٹر صاحب نے سندھ کی زمینوں کے ہندو ساہوکاروں کے غاصبانہ قبضے میں رہ جانے میں قیام پاکستان سے متصلاً قبل خود سندھ کے مسلمان سیاستدانوں اور وڈیروں کے کردار کی طرف اشارہ کیا ہے[لہ]۔ یہ سارا قصہ گھوٹکی (سندھ) میں انہیں ایک بزرگ نے سنایا جن کی یادداشت میں سب واقعات تقریباً محفوظ تھے۔ اب رفیق محترم نجیب صدیقی صاحب (سکھر) نے جو اس وقت بھی ڈاکٹر صاحب کے ساتھ تھے ایک بار ان صاحب سے مل کر واقعات کی ترتیب حاصل کی ہے۔ ان کا نام ماسٹر اللہ رکھا ہے اور وہ ایک قدیم سندھی ہونے کے علاوہ علاقے کی ایک معروف سماجی و سیاسی شخصیت ہیں۔ ان کی روایت کا خلاصہ کچھ یوں ہے:

—— ۱۹۳۶ء کے صوبائی انتخاب میں جو غیر جماعتی لیکن جداگانہ بنیاد پر ہوئے تھے سندھ میں مسلمانوں نے ساٹھ [٦٠] میں سے پینتیس [٣٥] نشستیں لے کر حکومت بنائی۔ پہلے وزیر اعلیٰ سر غلام حسین ہدایت اللہ تھے۔

—— مارچ ۱۹۳۸ء میں صوبائی اسمبلی کے ایجنڈے پہ چار بل تھے (۱) انتقالِ اراضی کا بل جس کی رو سے ہر اُس سندھی کو اپنی زمین واپس ملتی جو ۱۹۰۱ء میں مالک تھا لیکن بعد میں کسی بھی وجہ (بشمول رہن) سے محروم ہو گیا (۲) قرض بل جس کا منشاء یہ تھا کہ تمام قرض (جو ظاہر ہے کہ ہندوؤں کی طرف سے مسلمان زمینداروں پر تھے) بلاسود ہو جائیں گے اور بالاقساط واپس ہوں گے (۳) سُود بل یعنی ہر طرح کے سود کی منسوخی اور قرض کے صرف اصل زر کی واپسی اور (۴) شرعی بل جس کے ذریعے چیدہ چیدہ شرعی قوانین نافذ کئے جانے مقصود تھے۔

—— مارچ ۱۹۳۸ء تک تمام (یعنی پینتیس [٣٥]) مسلمان ممبرانِ اسمبلی ایک حلف کے تحت متحد تھے چنانچہ ۱۹۳۸ء میں بجٹ بھی متفقہ طور پر پاس ہوا لیکن اس خاص اجلاس

لہ سندھ کی زمینوں کے بارے میں مذکورہ بالا اشارہ اسی کتاب کے صفحہ ۵۲ کے فٹ نوٹ میں موجود ہے۔

میں محرم اور ہولی کی تعطیلات کے باعث پانچ دنوں کا وقفہ ہوگیا۔

—— ان پانچ دنوں میں ہندوؤں نے مِل جل کر سات مسلمان ارکانِ اسمبلی کو "توڑ" لیا۔ تمین تام ماسٹر صاحب کو یاد نہیں (ریکارڈ میں بہرحال محفوظ ہوں گے) باقی چار "اسمائے گرامی" تھے: جناب جی ایم سید، پیرزادہ عبدالستار، پیر الٰہی بخش اور اللہ بخش سومرو۔

—— ۱۸ مارچ ۱۹۳۸ء کو اجلاس وقفہ کے بعد دوبارہ شروع ہوا تو سر غلام حسین ہدایت اللہ کے خلاف تحریکِ عدم اعتماد لے آئی گئی۔ سر غلام حسین نے انتظار کی درخواست کی تاکہ سات "غیر حاضر" مسلمان ارکان اسمبلی میں پہنچ جائیں لیکن "وہ سات" نہ آنے تھے نہ آئے؛ وہ طلائی زنجیروں میں جکڑے جا چکے تھے یا طلسم سامری کے اسیر ہو چکے تھے۔ چنانچہ سپیکر (بھوج سنگھ وکیل) نے شام تک بحث کے بعد جب رائے شماری کرائی تو ساٹھ کے ایوان میں چھتیس[۴۷] کی اکثریت اٹھائیس[۴۸] کی اقلیت میں تبدیل ہو چکی تھی۔

—— سر غلام حسین ہدایت اللہ کی وزارت ختم ہوئی اور "اُن سات" میں کے "ایک" اللہ بخش سومرو نئے وزیرِ اعلیٰ ہوئے اور اسی کے ساتھ اُن چار دِنوں کی بساط لپیٹ گئی جو سندھی مسلمانوں کے لیے حیاتِ نو کی نوید جانفزا بنتے۔

. . . . . اگر اللہ نے چاہا تو قدیم سندھی مسلمانوں اور ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آنے والوں ہی کے دینی اتحاد سے برعظیم ہند و پاک میں اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے لیے سب سے مؤثر قوت فراہم ہو گی۔ اس لیے کہ ایک طرف صنم خانۂ ہند میں اسلام کی قدیم ترین اور عربی الاصل روایات کی امین سرزمین سندھ ہے اور دوسری طرف ہندوستان کے مختلف علاقوں سے اختیاری ہجرت کر کے پاکستان آنے والے مہاجرین اس وقت بھی جذبۂ ملی سے دوسروں کی نسبت زیادہ سرشار تھے اور گوناگوں قسم کی مایوسیوں اور حالات کی شدید ابتری کے باوجود اِن میں تاحال بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو سہ "ایک بلبل ہے کہ ہے محوِ ترنم اب تک۔ اُس کے سینے میں ہے نغموں کا تلاطم اب تک!" کے مصداق دینی و ملی جذبے کی وافر مقدار سے بہرہ ور ہیں . . . . .

". . . . . اور اب ضرورت صرف اِس امر کی ہے کہ ان دونوں طبقات میں سے اُن لوگوں کی غیرتِ دینی اور حمیتِ ملی کو للکارا جائے جو اللہ، اُس کے رسول ﷺ، اس کی کتاب اور اُس کے دین کے ساتھ ع "جو تجھ سے عہدِ وفا استوار رکھتے ہیں" کے مصداق خلوص و اخلاص کا تعلق رکھتے ہوں اور انہیں آمادہ کیا جائے کہ وہ . . . . . ع "نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیری!" کے مطابق کمرِ ہمت کس کر میدانِ عمل میں اتر آئیں . . . . . اگر ایسا ہو جائے تو کیا عجب اللہ تعالیٰ انہیں الفاظِ مبارکہ "وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَكَانُوْٓا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا" (ترجمہ: اور اس تعالیٰ نے چسپاں کر دی اُن پر تقویٰ کی بات اور وہ اس کے حقدار بھی تھے اور اہل بھی) کا مصداق بنا دے اور چشمِ فلک ایک بار پھر وہ نظارہ دیکھ سکے جو اُس نے آج سے تقریباً ڈیڑھ سو سال قبل رانی پور اور پیر جو گوٹھ کی خانقاہوں میں سید احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل شہید دہلوی رحمۃ اللہ علیہما اور اُن کے ان ساتھیوں کی مہمان نوازی اور خاطر مدارات کی صورت میں دیکھا تھا جن کا تعلق دہلی و یوپی، بنگال و بہار اور راجپوتانہ وغیرہ کے علاقوں سے تھا۔"